اور زراندوزی کی ممانعت کرتا ہے، اس سلسلہ میں انفاق کی فضیلت و برکت واضح کی ہے اور اسراف اور فضول خرچی کی کراہت و شناعت دکھائی ہے، دوسرے حصہ میں غربت و ناداری کی بحث ہے، اس میں یہ بتایا ہے کہ انبیاء کرام کی دعوت پر عموماً پہلے فقرا نے لبیک کہا ہے، پھر دنیا کی تحقیر، ہوس کی مذمت، زہد فی الدنیا اور قناعت و توکل کی فضیلت بیان کی ہے، اور مال و زر کی کمی کو موجب راحت اور کثرت کو باعث فتنہ و فساد بتایا ہے، اس سلسلہ میں رسول اکرمؐ اور صحابۂ کرام کی سادگی اور فقر کے واقعات بھی لکھے ہیں اور فقیروں کی تذلیل و اہانت کو خدا کی ناراضگی کا سبب قرار دیا ہے، اس کتاب کا لب لباب یہ ہے کہ دولت بذات خود قبیح نہیں ہے بلکہ اسکا غلط استعمال قبیح ہے، اور گو اسلام نے معاشی مسئلہ سے صرف نظر نہیں کیا ہے تاہم اس کے نزدیک انسان کا اصل مسئلہ معاد کا ہے اسلئے آخرت کی فکر، عقائد و اعمال کی درستگی اور دینی و ایمانی تشخص کو برقرار رکھنے پر مسلمانوں کو مکمل دھیان دینا ضروری ہے۔

تاریخ ادبیات گورکھپور، مرتبہ ڈاکٹر سلام سندیلوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۱۶۰، مجلد مع گردپوش، قیمت ۲۰ روپے، پتہ: ڈاکٹر سلام سندیلوی امام باڑہ پورب پھاٹک محلہ میاں بازار گورکھپور۔

گورکھپور لکھنؤ اور دلی جیسا ادبی مرکز تو نہیں تھا، مگر جو ادیب و شاعر یہاں پیدا ہوئے یا اس سے مدتوں وابستہ رہے انکی خدمات ادب کم اور غیر اہم نہیں ہیں علاوہ ازیں کئی اردو اخبار و رسالے بھی یہاں سے نکلے زیر نظر کتاب کے پانچ ابواب میں گورکھپور کی ادبی سرگرمیوں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے پہلے اس کا تاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہے، پھر فارسی نظم و نثر میں گورکھپور کی مختصر خدمات دکھائی گئی ہیں، تیسرے اور چوتھے باب میں بالترتیب گورکھپور کی اردو شاعری اور نثر نگاری کا حال اور ان شاعروں اور ادیبوں کا مختصر تذکرہ ہے جو ۱۹۲۵ء میں یا اس سے قبل پیدا ہوئے اور جو شاعر و ادیب اسکے بعد پیدا ہوئے انکا صرف نام گنا یا ہے، آخری باب گورکھپور کی اردو صحافت کیلئے خاص ہے اس میں تقریباً تیس اردو اخبار اور رسالوں کے متعلق معلومات درج ہیں، جو وہاں سے وقتاً فوقتاً شائع ہوئے، یہ کتاب گورکھپور کی ادبی سرگرمیوں کا مختصر خاکہ بھی ہے اور وہاں کے معروف و غیر معروف ۹۶ ارباب شعر و ادب کا مختصر تذکرہ بھی، لائق مصنف نے شاعروں کے اشعار اور نثر نگاروں کی تحریریں بھی نمونۃً نقل کی ہیں تاکہ انکے ادبی درجہ و مرتبہ کا اندازہ کیا جا سکے، ڈاکٹر سلام سندیلوی کی یہ ادبی خدمت قابل تحسین ہے، مگر انھیں اعتراف ہے کہ یہ نقش اول ہے۔

"ض"

جلد ۱۳۱ ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۳ء عدد ۶

مضامین

کاتب کی ضرورت

معارف پریس دار المصنفین اعظم گڈھ کے لئے ایک زود نویس اچھے کاتب کی ضرورت ہے، خواہشمند حضرات اپنے خط کا نمونہ پہلے بھیجکر دفتر دار المصنفین شبلی اکاڈمی اعظم گڈھ سے خط و کتابت فرمائیں،
منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

شذرات

قومی یکجہتی کے فروغ کے سلسلہ میں ہماری حکومت کی طرف سے اس کی بھی خواہش ظاہر کی گئی کہ ملک میں ہندو مسلمان کا پرسنل لا یکساں ہو،

عام مسلمانوں نے اس کو پسند نہیں کیا، ہمارے علماء بھی اس کی مخالفت میں متحرک ہوئے تو حکومت کو اعلان کرنا پڑا کہ مسلمانوں کی مرضی کے خلاف ان کے پرسنل لا میں مداخلت نہیں کی جائیگی جب مسلمان بڑی حد تک مطمئن تھے تو ادھر پھر آواز بلند ہونے لگی ہے کہ ملک کا پرسنل لا ایک کر دیا جائے اس کی حمایت میں کچھ ایسے مسلمانوں کے نام بھی لئے جا رہے ہیں جو عام طور سے جمہور مسلمانوں کی رائے کے خلاف حکومت یا یہاں کی اکثریت کی ہمنوائی کیا کرتے ہیں حکومت کی حکمت عملی اور زیرکی اس میں بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مطلب کے کچھ افراد کو عہدے اور دوسرے الطاف و اکرام سے نواز کے اس طرح تیار کر لے کہ وہ اس کے ہمنوا ہو کر اس کی مطلب براری میں مدد دیتے رہیں، حکومت کی حکمرانی کا تقاضا یہ بھی ہوتا ہے کہ ان لوگوں میں جو اس کے ہم خیال نہ ہوں پھوٹ، اختلاف اور نفاق پیدا کرتی رہے تاکہ وہ خود کامیابی کی شاہراہ پر گامزن رہے،

حکومت کو اپنی مطلب براری کے لئے ایسے حربے کو استعمال کرنے کا پورا حق ہے مگر جو ایسے حربے کی زد میں آ رہے ہیں ان کو بھی یہ حق ہے کہ وہ اپنی قوت مدافعت کو برقرار رکھ کر آسانی سے سپر انداز نہ ہو جائیں ہماری حکومت کو یہ تلخ تجربہ بھی ہو رہا ہے کہ محض چند افراد کو سر آنکھوں پر بٹھا کر ان کے ہم مذہبوں کو رام کرنا ضروری نہیں، یہ چند افراد اپنی ظاہری حب الوطنی کا ثبوت دیکر ذاتی فائدے تو ضرور اٹھاتے رہے، مگر ہوا دہی جو ان کے ہم مذہبوں کے سواد اعظم نے چاہا، مسلمانوں کے پرسنل لا کے سلسلہ میں حکومت کے ہوا خواہ اور نمک خوار اپنی تجدد پسندی اور بظاہر جذباتی ہم آہنگی کا طبل بجا کر ایک مشترکہ پرسنل لا کی وکالت چاہے جتنی بھی کریں مسلمانوں کی رائے عامہ کو نظر انداز کرنا حکومت کے لئے بالکل مناسب نہیں، اگر یہ اپنی طاقت یا خوش فہمی میں ایسا کر بیٹھی تو یہ آگ سے کھیلنا ہوگا،

مسلمانوں کے پرسنل لا کے جن احکام کی صراحت قرآن اور سنت میں موجود ہے، ان میں تو ہمارے علماء بھی کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے، بعض دنیا دار، جاہ طلب، اور ضمیر فروش مسلمان حکومت کی خوشنودی کی خاطر ایسا کرنا چاہیں تو ان کی جگہ حکومت کے بلند ایوان میں بن سکتی ہو، عام مسلمانوں کے دلوں کے نہاں خانوں میں وہ کوئی جگہ نہیں پا سکتے، اسلامی ممالک کے کسی دانشور یا مدبر کی ذاتی رائے بھی اس سلسلہ میں قابل اعتنا نہیں، البتہ پرسنل لا کے ان فقہی احکام میں جس کی صریح سند قرآن اور حدیث میں نہیں ہے، اور وہ فقہاء اور ائمہ کے قیاس اور اجتہاد پر مبنی ہیں، ان میں ضرورت زمانہ اور وقتی مصالح کے مطابق ترمیم کی گنجائش ہے، اس ترمیم کا حق علماء، فقہاء اور مجتہدین ہی اپنے اجتماعی فیصلے کے ذریعہ سے استعمال کر سکتے ہیں، اسلامی حکومت بھی ان کے اس حق کو سلب نہیں کر سکتی، یہ انہی کے فیصلے کی پابند ہو کر کوئی قانون بنا سکتی ہے، مثلاً حالات کے تقاضے اور ضرورت کی بنا پر علماء و فقہاء تعدد ازدواج کو مناسب نہیں سمجھتے، تو اسلامی حکومت اس کو روک سکتی ہے، مگر کسی حال میں علماء، اور نہ اسلامی حکومت اس کو مستقل طور پر ممنوع قرار دے سکتی ہے، اسی طرح علماء و فقہاء معاشرہ کی خاص خاص برائیوں کے انسداد کے لئے تعدد ازدواج کو زیادہ سے زیادہ رواج دینا ضروری سمجھتے ہوں، تو اسلامی حکومت اس کے لئے ان کی معاون ہو سکتی ہے،

مگر ہندوستان میں ہماری حکومت کو یہ حق حاصل نہیں، یہ بڑی روادار، اعلیٰ قسم کی سیکولر، اور مسلمانوں کی خیر خواہ کیوں نہ ہو کسی لحاظ سے اسلامی حکومت نہیں، اس کی رواداری، فراخ دلی، اور ملک کی خیر خواہی کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کے ان مسائل میں مداخلت کرکے ان کے جذبات کو مجروح نہ کرے،

۱۹۴۷ء سے اب تک کل چھبیس ۲۶ برس گذرے ہیں، اس تھوڑی سی مدت میں مسلمانوں کو شعوری یا غیر شعوری، جا یا بیجا، طریقے پر کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ کہیں ان کا ملی اور مذہبی وجود ختم نہ ہو جائے، حالانکہ

مسلمانوں نے یہاں صدیوں حکومت کی، ہندوؤں کو یہ خطرہ کبھی نہیں ہوا کہ ان کا وجود ختم ہو جائیگا، اس حقیقت کا اعتراف یہاں کے غیر جانبدار مورخوں نے بھی کیا ہے کے۔ ایم پنیکر نے اپنی کتاب "اے سروے آف انڈین ہسٹری" میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کے زمانہ میں ہندوؤں کی سوسائٹی جوں کی توں رہی، یہ اس لئے کہ مسلمانوں نے ان کے پرسنل لا، اور مذہبی مراسم و عقائد میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی، رام پرشاد کھوسلا نے اپنی کتاب کنگ شپ اینڈ نوبلیٹی انڈر دی مغلز میں تو یہاں تک رقمطراز ہیں کہ عدل و انصاف میں، اہتمام اور مذہبی رواداری کی پالیسی کی وجہ سے مغلوں کی حکومت میں عوام ہمیشہ مطمئن رہے، اسلامی ریاستوں میں سیاست اور مذہب کا گہرا لگاؤ رہا ہے لیکن مغلوں کی مذہبی رواداری کی وجہ سے کوئی سیاسی خطرہ نہیں ہونے پایا، اور کسی زمانہ میں یہ کوشش نہیں کی گئی کہ حکمراں قوم کا مذہب محکوموں کا بھی مذہب بنایا جائے، حتیٰ کہ اورنگزیب نے بھی ملازمت کے لئے اسلام کی شرط نہیں رکھی تھیں، مغلوں کے عہد میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ لوگوں کے ضمیر کے خلاف کوئی قانون بنایا گیا۔"

سی۔ اف۔ اینڈریوز گاندھی جی کے قدردانوں اور دوستوں میں تھے، انھوں نے منشی ذکاء اللہ پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ جب کبھی میں دہلی کے قدیم باشندوں کے پاس گیا انھوں نے کسی پس و پیش کے بغیر یہ بات بیان کی کہ آخری مغل بادشاہوں کا برتاؤ ان کے ساتھ بہت اچھا تھا، ان کو کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی، یہ ساری باتیں صدیوں کی کوششوں کا نتیجہ تھیں، دوسری امور میں مغل شاہنشاہوں کے خلاف بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن وہ بجا طور پر اس نیک نامی کے مستحق ہیں کہ مذہبی تعصب ان پر غالب نہیں رہا، اس بنا پر وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ اپنی ہندو رعایا کے ساتھ مہربانی کا سلوک اور غیر جانبدارانہ انصاف کریں، انھوں نے شاہی دربار کے امراء پر بھی اچھی طرح ذہن نشین کر دیا تھا کہ وہ ہندوؤں کے احساسات و جذبات کا خیال انہی کی طرح کریں،

موجودہ حکومت اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ کر رہی ہے اس کی نیک نامی کا معیار چند مفاد پرست افراد کے بیانات یا صحافت نگاروں کی کالم نویسی یا سرکاری ذرائع ابلاغ کے پروپیگنڈہ پر قائم نہیں کیا جا سکتا ہے، آئندہ کے غیر جانبدار مورخین کے قلم کوئی سرکاری بندش نہ ہوگی، آج کی اقلیت نصاف پسندی اور فراخدلی کے فیصلہ کا حق انہی کو ہوگا،

مقالات

اسلام اور مستشرقین

از- پروفیسر سید حبیب الحق ندوی، ڈربن یونیورسٹی، جنوبی افریقہ،

(۲)

انیسویں صدی عیسوی کے مستشرقین اور ان کے اسکالرشپ کی نیرنگیاں

انیسویں صدی کی جھولی میں جو میراث آئی وہ بھی اسلام دشمنی کی میراث تھی، سابقہ رویہ میں مطلق تبدیلی نہیں آئی، ۱۸۰۰ء سے ۱۸۴۰ء تک تقریباً نصف صدی میں متعدد کتب اسلام اور محمدؐ پر شائع ہوئیں، ان میں سب سے اہم اور قابل ذکر ڈیوڈ پرائس کی تالیف Chronological Retrospect of Mahommedan تھی، جو ۱۸۱۱ء سے ۱۸۲۱ء تک شائع ہوئی۔ مولف نے اپنی تاریخ میں آنحضرت کے عہد سے لیکر ہند کے مغل شہنشاہ اکبر تک کے تاریخی وقائع درج کئے ہیں، دوسری اہم قابل ذکر تالیف ایڈورڈ اپہام Edward Upham کی ہے موصوف نے ترکی کی تاریخ History of Ottomon Empire لکھی جو ۱۸۲۹ء میں شائع ہوئی، مولف نے آنحضرت صلعم کو حسب معمول نبی کاذب کے لقب سے یاد کیا۔

یہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ صلیب کے بعد سے نثری ادب کے دوش بدوش نظم نے بھی اسلام دشمنی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، پیش رو شعراء کا ذکر مختصراً گذر چکا ہے، یہاں پر انیسویں صدی کے

شہرہ آفاق جرمن شاعر گیٹے کا ذکر لازمی ہے۔ گیٹے (۱۷۴۹ء تا ۱۸۳۲ء) نے اٹھارہویں
صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے نصف اول پر گہرے اثرات چھوڑے۔ شاعر نے
بظاہر دراسات اسلامیہ اور شرق اوسط سے بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا، مگر درحقیقت اسلام کے
خلاف اپنے پیش رو قائدین کے نقش قدم سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹا بلکہ آگے نکل گیا۔ ۱۷۷۳ء
میں اس نے آنحضرتؐ پر ایک نظم ترانہ محمد Mahomet is Gesang لکھی آنحضرتؐ کو ایک
چشمہ سے تعبیر کیا، اور وحدۃ الوجود کا درس بناتے ہوئے احترام کے چند کلمات استعمال کئے۔ گیٹے کے
اسی بیان پر کارلائل کو اس قدر حیرت ہوئی کہ اس نے اس پر نقد کرتے ہوئے لکھا کہ اگر واقعتاً گیٹے کا
تبصرہ صحیح ہے تو ہم سارے عیسائی دراصل مسلمان ہیں۔ گیٹے نے ۱۷۷۰ء سے ۱۷۷۳ء تک اپنی
نامکمل نظم لکھی، شاعر نے ثابت کیا کہ محمدؐ ابتداء میں مخلص تھے، بعد میں وہ مادیت اور بوالہوسی
کے شکار ہو گئے۔ اور ان کا روحانی حصہ ضائع ہو گیا، یہ وہی کلاسیکی مضمون ہے جو آج تک
مستشرقین کی اسکالرشپ کا طرۂ امتیاز ہے۔ شاعر نے یہ بھی ثابت کیا کہ محمدؐ کی شخصیت مبہم اور
غیر واضح تھی، ایکٹ اول میں اس نے آنحضرتؐ کو چاند تاروں کا پوجاری ثابت کیا ہے، بعد میں
ایک خدا کی عبادت کی طرف مائل ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔ ایکٹ دوم کا مرکزی موضوع
اسلام کی اشاعت اور پیروان اسلام کی کثرت ہے، ایکٹ سوم میں شاعر بتاتا ہے کہ محمدؐ نے
فتح مکہ کے بعد کس طرح اپنی گرفت کو مستحکم کیا اور مذہب اسلام کو پھیلایا، آنحضرتؐ نے اسی مقصد
کے لیے قوت اور عیاری دونوں کو استعمال کیا، ایکٹ پنجم میں شاعر آنحضرتؐ کو مادیت سے
مغلوب ہو کر ایک سلطنت کی داغ بیل ڈالتے ہوئے دکھاتا ہے، ان نظریات سے گیٹے کے
عقائد و نفسیات جھلک کر سامنے آجاتے ہیں۔ یورپ کی فضا ہمیشہ مکدر رہی، دو ایک مستشرقین
نے اگر انصاف کا مطالعہ کیا تو وہ ملعون و معتوب ہوئے۔ انیسویں صدی کی ممتاز شخصیات میں

کارلائل کا نام محتاج تعارف نہیں ہے، درحقیقت پوری صدی اس کی ذات میں ڈوب گئی،
۱۷۹۵ء سے ۱۸۸۱ء تک کارلائل کا نام نامی زندہ رہا، انیسویں صدی کے نصف اول
تک فضا مسموم رہی۔ مگر نصف ثانی میں پھر اسلام اور محمدؐ کی جانب رواداری اور انصاف
پسندی کے مطالبے شروع ہوئے، اس تحریک کے قائدین میں کارلائل کا نام قابل ذکر ہے۔ یہ
مطالبہ بربنائے اخلاص نہیں تھا، بلکہ یورپ کی بدلتی ہوئی فضا تھی، سیاسی تبدیلیاں تھیں
اور شبانہ روز جدت پسند اور سائنسی ترقیات کے چیلنج کی کشمکش تھی، تعصب اور تقشف کے
خلاف عام لہر یورپ میں بڑھتی جارہی تھی، اسی فضا (Liberal climate) نے
بعض مستشرقین کو اسلام کے خلاف سابقہ موقف پر نظر ثانی کے لیے مجبور کیا، تبدیلی کا یہ سہرا یورپ
کی سب سے طاقتور رومانی تحریک (Romantic Movement) کے سر ہے، جس نے یورپ کے
تمام فرسودہ نظام حیات، کلاسیکی عقائد، تقشف اور تعصب کو ایسا چیلنج کیا کہ سارا یورپ
ہل گیا، سیاست ہو یا ثقافت ادب و کلچر ہو یا دین و مذہب ہر میدان پر اسکا زوردار
اثر پڑا، یہ تحریک دراصل کلاسیکی نظریات کے خلاف ایک بغاوت تھی، اس سے ٹکرانا مشکل تھا،
کارلائل ان ہی تحریکات سے متاثر ہوا، اس تحریک کا عظیم کارنامہ یہ تھا کہ نوخیز نسل
کے اندر اپنے پیش رو و متقدمین کو چیلنج کرنے کی جراءت مندانہ ہمت پیدا کر دی، تمام رسم
و رواج کا قلع قمع ہو گیا، نقلی اور بناوٹی زندگی کے بجائے اصلی اور فطری زندگی گزارنے کی دعوت
دی گئی، اس نے مشرق کے حقیقی مطالعہ اور افہام و تفہیم کا دروازہ بھی کھول دیا۔ اسی کا
اثر تھا کہ کارلائل نے اپنے دیگر موضوعات کے ساتھ اسلام کو بھی موضوع بحث بنالیا۔ یہ امر
واضح رہے کہ انیسویں صدی تک مستشرقین کلیۃً اسلامی اسکالر نہیں تھے، جیسا کہ آج ہیں، بلکہ
ہر فن مولیٰ تھے، اسلام کا مطالعہ اسی کا ایک حصہ تھا۔

کارلائل اسلام کا اور دینِ محمدی کا ہرگز مخلص نہیں تھا۔ اس نے اسلام اور محمدؐ کو موضوع بحث محض اس لئے بنایا کہ اب اسلام قبول کرنے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ اس لئے واضح الفاظ میں لکھا کہ محمدؐ پر اس لیے بحث اس سے نہیں کی ہے کہ وہ ممتاز نبی تھے، بلکہ محض اس لئے کہ اب ارتداد کا مطلق خطرہ نہیں تھا۔ اب کوئی عیسائی اسلام قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ اب ہم آزادی کے ساتھ اسلام کے بارے میں لکھ سکتے ہیں، اور محمدؐ کے بارے میں چند اچھے کلمات بھی استعمال کر سکتے ہیں یعنی اسلام اور محمدؐ کی مخالفت اس لئے کی جا رہی تھی کہ اسلام کی عالمی قبولیت کو چیلنج کیا جائے ملاحظہ ہو۔

The Hero as Prophet نیویارک ۱۹۵۲ء ص ۱۱) ....

..... اس مقدمہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ایک بیدار مغز ناقد کارلائل کی [illegible] کے تحسینی کلمات کو جو اس نے اسلام یا محمدؐ کے بارے میں لکھا تھا پڑھتا ہے تو اس کے قلب پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

کارلائل کی تعریفیں ملاحظہ ہوں، وہ رقمطراز ہے کہ اسلام اور محمدؐ کے خلاف افترا اور کذب کا جو پلندہ یورپ میں جمع کیا گیا ہے وہ ہم عیسائیوں کے لیے باعث شرم ہے، یہ باتیں کہ محمدؐ کاذب تھے، یا مذہب اسلام مجموعۂ خرافات ہے، اس روشن دور میں قابل قبول نہیں، محمدؐ کی تعلیم ...۱۸۰ ملین انسانوں کی زندگی کا مشعل ہے، بارہ صدیوں سے انسانی ارواح اسلام کی گرفت میں ہیں، کیا یہ سب کذب اور جھوٹ ہے؟ یہ نظریات خرافات کا مجموعہ ہیں، (ص ۱۲) اس نے بطور خلاصہ لکھا کہ محمدؐ نے عرب کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لا کھڑا کیا، کارلائل پر سیل کے ترجمۂ قرآن کے واضح اثرات موجود ہیں، اس کے خیالات اور تحریر پر بھی اسکے چھاپ ہیں، بلکہ یہی ترجمہ اس کے لکچرز کی اساس ہے، ان خوبصورت تعریفی کلمات کے باوجود کارلائل نے آنحضرتؐ کی شخصیت کو ایک نبی برحق کی حیثیت سے نہیں بلکہ اس نے آپ کو

تاریخ کی عظیم شخصیت، ایک بڑا ہیرو اور قائد Great Human Person کی حیثیت سے ابھارنے کی سعی کی، مگر پھر اسی کارلائل کے دیگر کلمات کو پڑھکر قاری ششدر رہ جاتا ہے جب وہ آنحضرتؐ کو جنگلی اور بادیہ نشین Son of the wilderness غیر مہذب حیوانی اور وحشیانہ آغوش فطرت کا پروردہ Uncultured semi-barbarous son of nature قرار دیتا ہے، یہ بیانات تاریخی حقائق کے خلاف ہیں، آنحضرتؐ قریش مکہ میں تھے جو مہذب، دولت و تجارت کی قیادت کر رہے تھے، نہ تو وہ بادیہ نشین تھے نہ ہی صحرائی جانور تھے، کارلائل کی نیت جو بھی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کی تحریریں قدیم دور کے تعصب اور خرافات سے پہلی بار بغاوت تھی، یہ تبدیلی رواداری اور انصاف پسندی کی جانب ایک نیا قدم ضرور تھا، مگر کارلائل کی ان تحریرات کو دیگر مستشرقین نے بے حد ناپسند کیا، اور کارلائل کی تالیفات پر رومانی تعبیرات کا ٹھپہ لگا دیا، قدیم روش سے سرتابی کو معصیت تصور کیا۔

انیسویں صدی کے وسط تک آنحضرتؐ کی سوانح کے عربی مصادر، مثلاً ابن ہشام کی سیرت واقدی اور ابن سعد اور طبری کی تالیفات یورپ میں عام طور پر رائج نہیں ہوئی تھیں یہ سب مسودات اور مخطوطات کی صورت میں پڑے ہوئے تھے، لیکن رینکے نے جب تاریخی تنقید کی تحریک چلائی اور مصادر کی سراغرسانی کا زور ہوا تو تاریخ فہمی میں نیا انقلاب برپا ہوا، عربی مصادر کے مطالعہ پر زور دیا گیا، جرمنی کے مستشرقین نے مسلم شرق اوسط، براعظم ہند و پاک کے دورے شروع کئے، کتب خانوں کی تاریکیوں میں پڑے محتاج توجہ مسودات و مخطوطات کو روشنی میں لایا، کریمر (Alfred van Kremer) نے دمشق سے واقدی کی کتاب المغازی کا نسخہ برآمد کیا، ہندوستان سے تین قیمتی مخطوطات برآمد ہوئے، اسپرنگر اور دیگر مستشرقین نے دہلی سے آنحضرتؐ کی سوانح پر تین قیمتی مخطوطات حاصل کئے، ۱۸۵۰ء

کے بعد ہندوستان کے دوسرے شہروں سے بھی مخطوطات برآمد ہونے شروع ہوئے۔

ابن ہشام، ابن سعد اور طبری کے قدیم ترین نسخے ہندوستان سے بھی برآمد ہوئے۔ اواخر انیسویں صدی تک یہ مخطوطات یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی منتقل ہونے لگے، اور اس طرح مستشرقین یورپ کی رسائی اصل مصادر تک عام ہو گئی، ان ہی بنیادوں پر نئی کتب کا ظہور ہونے لگا۔

گسٹاو ویل Gustaw Weil نے آنحضرتؐ کی زندگی اور تعلیمات پر ایک کتاب Mohammad der Prophet sein Leben und seine Lehre لکھی، مولف کے پاس ابن ہشام کا قدیم نسخہ موجود تھا، اس کے مطالعہ اور تحلیل وتفرید میں اس نے تاریخی تنقید کے نئے اصول اور قواعد وضوابط اختیار کئے، اور آنحضرتؐ کے ساتھ انصاف پسندی کا رویہ اختیار کیا، مگر قدیم کتب فکر سے آزاد نہ ہو سکا، اس کا موقف قدیم اور فرسودہ خیالات کے مدار سے ہٹ نہیں سکا، اس کے خیال میں چونکہ محمدؐ نے قدیم اور جدید بائبل کا خوبصورت درس توحید اس قوم میں واپس لائے جو ایمان کھو چکی تھی، اس لئے محمدؐ کو غیر مسلم بھی خدا کا پیامبر تسلیم کر سکتے ہیں، بالفاظ دیگر اسلام کو عیسائی الاصل اور یہودی الاصل ثابت کیا، بہرحال ان تحریرات نے رواداری کی فضاء کو تقویت بخشی، اور دیگر مستشرقین پر بھی اسکا اثر پڑا۔

فرانسیسی مستشرق کاسن دی پرسی وال Goussin de Perceval نے ۱۸۴۷ء میں تاریخ عرب Essai Sur Li Histoire Arabes لکھی اور اپنے رویہ میں نرمی کا مظاہرہ کیا، ولیم میور اپنی زہرافشانیوں کے لیے معروف ہے، مگر وہ نئی تحریکات سے متاثر ہو کر کم از کم اپنے آپ کو روشن خیال ثابت کرنے کا دعوی ضرور کرنے لگا، فرانسیسی مستشرق نے بڑی ہمت سے کام لے کر لکھا کہ محمدؐ کو محض کاذب کہنا ناانصافی ہے وہ اخلاص کے ساتھ

اپنی قوم کو جہالت سے نکالکر روشنی کی طرف لائے

تاریخی مصادر کی نصی تنقیدات اور تنقید تاریخ کے نئے اصول وضوابط نے مزید نئے مسائل لا کھڑے کئے، سب سے پہلا مسئلہ آنحضرتؐ کی سیرت کے اصلی مصادر کی ثقاہت کے متعلق اٹھایا گیا، مستشرقین تحقیقات کے بعد پھر اپنے اصلی موقف پر پہنچ گئے یعنی اسلام اور محمدؐ کی دعوت یہودی اور عیسائی روایات کی مسخ شدہ صورت ہے، اس میں کوئی نیاپن نہ تھا یہ تو وہی مدیا دل زمانہ کی بازگشت تھی، البتہ اس پورے موضوع کا ایک نیا علمی نام وضع کیا گیا جسے ہم اسلام کی اصلیت کے نام سے جانتے ہیں، اور جو آج مغربی جامعات کا محبوب موضوع درس وتدریس ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا۔

۱۸۳۳ء میں ابراہام گیگر Abraham Geiger نے ایک مقالہ زیر عنوان What did Muhammad take from Judaism محمدؐ کے یہودی مصادر وماخذ پیش کیا اور بہت سے نئے نظریات کی داغ بیل ڈال دی، اب ایک نئی تحریک چل پڑی کہ یہودیت ونصرانیت اور اسلام کے درمیان قریبی ربط وضبط ثابت کیا جائے، تاکہ محمدؐ کے یہودی وعیسائی ماخذ کو حتمی طور پر ثابت کر دیا جائے، یہاں پر اس کتاب کا ذکر کر دینا قاری کی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جو ۱۹۲۷ء میں نیویارک سے زیر عنوان "اسلام کی یہودی بنیاد" The Jewish Foundation of Islam شائع ہوئی، اور اس کے مولف ییل یونیورسٹی Yale University میں سامی زبانوں کے پروفیسر چارلز کٹلر ٹوری Charles Cutler Torroy ہیں اس پر مقدمہ معروف مستشرق رابنتھال Franz Rosenthal کا ہے جس نے ابن خلدون کا ترجمہ کیا ہے، اور اسلامی تاریخ نویسی پر مبسوط کتاب بھی لکھی ہے۔

اس کتاب پر مبسوط نقد راقم الحروف کی کتاب پیغمبر اسلام اور مستشرقین میں ملاحظہ ہو۔

اسلام کی اصلیت اب مستشرقین کا محبوب موضوع بن گیا ہے اور تین معروف مستشرقین ولیم میور اسپرنگر اور نالدیکے، اس تحریک کے سرخیل بن گئے، اسپرنگر نے آنحضرتؐ کے مطالعہ کا ایک نیا اسکول قائم کیا جسے بائیولوجی یا علم الامراض یا اسباب امراض کا اسکول کہا جا سکتا ہے۔

یہ واضح رہے کہ میور کی طرح اسپرنگر بھی برطانوی سول سروس کا ملازم تھا، اس نے اسلام اور آنحضرتؐ پر متعدد کتب لکھیں ان میں حسب ذیل تین تالیفات قابل ذکر ہیں۔

۱۔ حیات محمدؐ اصل مصادر کی روشنی میں الہ آباد ۱۸۴۸ء۔ 1. Life of

Muhammad from Original Sources, Allahabad 1848

۲۔ حیات اور تعلیم محمدؐ (۳ جلدیں، مطبوعہ برلن از ۱۸۶۱ء تا ۱۸۶۵ء۔

2. Das Lsban and Lehre des Muhammes (Berlin 1861-
1865 3 vols)

۳۔ محمدؐ اور قرآن ایک نفسیاتی مطالعہ۔ (ہیمبرگ ۱۸۸۹ء)

3. Mohammad under Koran: Eine Psychologische
Studies(Hamburg1889)

ان تالیفات نے، جنہیں اسلام کی اصلیت کے اثبات پر پوری قوت صرف کی گئی تھی، نقد و نظر کا ایک نیا طوفان برپا کر دیا، اسپرنگر چونکہ خود ڈاکٹر تھا، اس لیے اس نے چودہ سو سالوں کے بعد بھی اسلام اور محمدؐ کا طبی معائنہ کرنا ضروری سمجھا، طبی معائنہ کی رپورٹ میں اس نے ثابت کیا کہ آنحضرتؐ اعصابی مریض، یا مصروع (Epileptic) تھے، طبی معائنہ نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ آنحضرتؐ کا نروس سسٹم چونکہ خراب تھا، اس لیے ہذیان اور بدحواسی کے دورہ میں انھوں نے قرآن کی تصنیف گڑھ لی، نیز اسلام نامی مذہب کو

گڑھ لیا۔ اب اسلام ہذیان الاصل قرار پایا، محمدؐ پر چونکہ ہذیان یا اختلاس (Hallu-cination) اور اعصابی اضطراب جو محض ہنسنے اور رونے کا سبب بنتا ہو Hysteric Frenzy کے دورے پڑتے تھے، اس لیے اسلام وجود میں آ گیا۔

اسلام کی اصلیت کی یہ بالکل نئی اور اچھوتی تعبیر سامنے آئی اب آنحضرتؐ کی سیرت و سوانح کو طبی نقطۂ نظر Pathological Approach سے دیکھنے کی ضرورت محسوس کی گئی، اور اسے مستقل ایک اسکول کی حیثیت دیدی گئی، فرائڈ اور دیگر علمائے نفسیات کے دور میں یہ اسکول جنسی آسیب کی زد میں آ گیا، جس کا ذکر آئندہ آئے گا۔

سر ولیم میور برطانوی سول سروس کا ملازم اور اسکوٹش اصلیت کا متقشف کیتھولک عیسائی تھا، اس نے چار جلدوں میں حیات محمدؐ لکھی، جو لندن سے ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۱ء کے درمیان شائع ہوئی، یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ برطانیہ اسلام کے ازلی دشمنوں میں رہا ہے صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں رچارڈ کی شکست کا غم ہنوز باقی ہے، اس کا انتقام برطانیہ نے تاسیس اسرائیل کے بعد لے لیا ہے، مگر نفرت کی آگ سلگ رہی ہے، ولیم میور کی حیات محمدؐ (Life of Mnhammad) دراصل دریدہ دہنی اور از منۂ وسطی کے خرافات کا مجموعہ ہے، خالص کیتھولک نقطۂ نظر سے یہ کتاب لکھی گئی ہے، مگر انگریزی خوان عوام کیلئے مستند مصدر ہے، ولیم میور نے آنحضرتؐ کو نبی کاذب کا خطاب دیکر یورپ کے ان مستشرقین کے خلاف سخت برہمی کا مظاہرہ کیا، جو اسلام اور محمدؐ کے ساتھ رواداری کا مطالبہ کرتے تھے، اور اعلان کر دیا کہ اہل یورپ اپنے روایتی موقف میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے، ولیم میور کی شدت نفرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے اسلام اور محمدؐ اور قرآن کریم کو تہذیب، آزادی اور حق کا بدترین دشمن قرار دیا، ایسا دشمن جو آج تک

انسانی تاریخ میں پیدا نہیں ہوا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ محمدؐ (العیاذ باللہ) شیطان کے آلۂ کار تھے، ولیم میور یہ تمنا اور آرزو لیکر دنیا سے رخصت ہوگیا کہ ایک نہ ایک دن اہل اسلام توبہ کریں گے اور عیسائیت قبول کر کے جہل و ضلالت سے نجات حاصل کریں گے۔

تاریخی تنقید کا مکتب فکر جو نالدیکے نے قائم کیا تھا، اس کے اثرات ختم نہیں ہوئے، نالدیکے، اسپرنگر اور ولیم میور سے زیادہ دریدہ دہن ثابت ہوا، اس نے تاریخ قرآن (Gesehichte des Qoranis) لکھی جو برلن سے ۱۸۶۰ء میں طبع ہوئی، آج تک یعنی سو سالوں سے مستشرقین کی رہنمائی کے لیے یہ تاریخ مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے اس نے اپنے پیش رو کے طبی معائنہ سے مخالفت کرتے ہوئے لکھا کہ محمدؐ ہذیان کے مریض نہیں تھے، بلکہ وہ انتہائی اور جذباتی دورے (Fits of emotion) کے مریض تھے، اسی دورے کے زیر اثر انکو اس بات کا یقین آگیا کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، اسی میں انھوں نے قرآن کی تالیف کر ڈالی ساتھ ہی اسلام نامی مذہب کی داغ بیل ڈال دی، یہ تمام تالیفات ان کے مرکزی خیالات اور عمودی مضامین ارمنۂ وسطیٰ یالاطینی خرافات سے کسی طرح مختلف نہ تھے۔

بیسویں صدی عیسوی کے مستشرقین اور اسلام کا تحلیلی اور سائنسی مطالعہ

انیسویں صدی کے اواخر سے مستشرقین، نقد اسلام کے نئے مکاتب فکر کی تاسیس میں لگے ہوئے تھے جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا، قاری کا مذاق بدلتا گیا، سیاسی اور معاشی احوال میں تغیر آگیا، مستشرقین کی اسکالرشپ چولے بدلتی گئی، پرانی شراب نئے جام میں ڈھالی جانے لگی۔

جیسے جیسے یورپ کی فضا بدلی مستشرقین کی اسکالرشپ بھی بدلی، ایک زمانہ تھا جب آنحضرتؐ کی مذہبی حیثیت کو ختم کرنے کی امکانی سعی کی گئی، جنس و جنگ کے اتہامات لگائے گئے۔ اسلام کو بزور شمشیر پھیلانے یا یہودیت و مسیحیت کی بگڑی ہوئی شکل قرار دینے کا چرچا تھا، وغیرہ وغیرہ

جب یورپ پر نفسیات کا بھوت سوار ہوا تو اسلام اور محمدؐ کے مطالعہ میں نفسیاتی اور طبی قوانین نافذ کئے گئے، اور سعی کی گئی کہ نفسیاتی امکانیات اور جوہری توانائی (Psyoho dymawics) کی روشنی میں آنحضرتؐ اور اسلام کا معائنہ کیا جائے، چنانچہ محمدؐ کے مطالعہ میں علم الامراض کے اصول نافذ کئے گئے، اسٹریا کا معروف عالم نفسیات فرائڈ (Freud) متوفی ۱۹۳۹ء حیات انسانی پر جنس کا آسیب بنکر سوار ہوگیا اواخر انیسویں صدی میں آنحضرتؐ کی سیرت و سوانح کے مصادر پر نقد اور جرح و تعدیل کا سلسلہ شروع ہوا، اب نقد کا سارا زور قرآن کریم، احادیث نبویہ اور سیرت نبی کی تحلیل و تعزیر پر تھا، قرآن کریم کو غیر مرتب اور مبہم توہمات کا مجموعہ قرار دیا گیا، غیر مہذب اور غیر متوازن ہونے کی وجہ سے غیر ثقہ بھی سمجھا گیا یعنی قرآن، اسلام اور محمدؐ کی تحریکات کی واضح صورت پیش کرنے سے قاصر ہے، قرآن پر سنگین حملوں کے بعد نزلہ احادیث نبویہ پر اترا، چونکہ احادیث قرآن کے بعد مصدر ثانی کی حیثیت رکھتی تھیں لہذا انکو منہدم کرنا مستشرقین کا اولین فریضہ تھا، اب احادیث کے کذب و افترا کے افسانے گھڑے گئے، یوں تو نالدیکے نقد حدیث کے اسکول کا سرخیل تھا لیکن انکار حدیث کے اسکول کی داغ بیل گولڈ زیہر (Innac Goldziher) نے ڈالی اور اپنی تالیف دراسات محمدیہ (Mahammedanisch Studien) میں اپنے نظریہ کی اساس ڈالی اس نے اس سوال کے ذریعہ کہ کیا سیرت نگاری کے لیے احادیث پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے؟ سب سے عظیم فتنہ کھڑا کیا، بیسویں صدی میں مستشرقین کی اسکالرشپ زمانہ کے ساتھ دو حصوں میں بٹ گئی، ایک تو انکار حدیث کے مکتب فکر سے منسلک رہی اور دوسری نئی ابھرتی ہوئی اشتراکی یا کمیونسٹ تحریک کی گود میں پرورش پانے لگی، اول الذکر مکتب فکر نے غیر یقینی، کمزور کے احادیث کی فہرست مرتب کی اور ان احادیث کو خوب اچھالا جو مذہبی اور سیاسی فرقوں نے ذاتی مفادات کے پیش نظر گڑھی تھیں، یا جو خاص قبائل، افراد اور حکام

کی تائید میں تھے، گولڈ زیہر نے ان تمام احادیث کو مسترد کر دیا، انکار حدیث کے بعد گولڈ زیہر نے سیرت کے مصادر پر جراحی شروع کر دی، اور انکو بھی اس نے بیانیہ احادیث (Narrative Ahadith) کے زمرہ میں ڈال دیا، اسلامی اسناد کے پورے سلسلہ کو چیلنج کرنے کے بعد اس نے اعلان کر دیا کہ یہ مصادر ثقاہت کی ضمانت نہیں دے سکتے، یعنی ہدم دین اسلام کی آخری کڑی تھی، نامی مستشرق ہنری لامینس (Henri Lammenns) نے مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا، اور یہ ثابت کرنے کی پیہم کوشش کی کہ ہجرت مدینہ سے قبل اسلامی روایات کا سارا ڈھانچہ جس پر آنحضرتؐ کی سوانح کھڑی کی گئی ہے، بے بنیاد اور غیر ثقہ ہے، اور محمدؐ کی مدنی زندگی کی ساری روایات داستان و افسانہ سے زیادہ درجہ نہیں رکھتیں، اسلام اس کی نظر میں ایک تاریخی المیہ تھا، سب سے دلچسپ تحقیق مولف نے یہ پیش کی کہ آنحضرتؐ کثیر خوری کے مریض تھے اور یہی انکی موت کا سبب بھی بنا. کثیر خوری کی وجہ سے انپر لقوہ مرگی کے دورے پڑے، ان ہی حملوں میں وہ جاں بحق ہو گئے ہنری ابتدار بیسویں صدی میں شام اور لبنان کا مشنری مبلغ تھا، اسلام اور آنحضرتؐ کے خلاف شدت نفرت کے اظہار میں اس نے کوئی کمی نہیں کی البتہ اس پر مصرح تحقیق اور اسکالرشپ کا غلاف ڈال دیا، اور اس کا نام سائنسی منہج تنقید رکھدیا، اس نے آنحضرتؐ پر وحشیانہ حملے کئے، اور آپ کے اخلاص کو تسلیم کرنے سے قطعی انکار کر دیا۔

یورپ میں اچانک معاشی تحریکات کا طوفان اٹھا، جس کے نتیجہ میں کمونسٹ یا شوسلسٹ تحریک نے سر اٹھایا، اور یورپ کی پوری سیاست کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، چونکہ سامعین، قارئین اور زمانہ کا مزاج بدل گیا تھا، اسلام اور آنحضرتؐ پر نقد و نظر کا اسلوب بھی بدل گیا کلاسیکل نظریہ یعنی دنیا کی تاریخ عظیم انسانوں کی سوانح حیات کا نام ہے، بدل گیا، اس کی جگہ کارل مارکس کے نظریہ نے لے لی، جس میں انسان معاشیات کا خلیہ ہے، یعنی تاریخ معاشی اور

سماجی حرکات کا نام ہے، چونکہ یورپ کا سارا تنقیدی نظام کمیونسٹ کے پنجہ استبداد میں آ گیا تھا، اس لئے اسلامی اسکالرشپ اور مستشرقین دونوں اس کی گرفت میں جکڑ گئے۔

جرمنی کے یہودی اور عیسائی مستشرقین دراسات اسلامیہ میں پیش پیش رہے، ہیوبرٹ گریمی (Huber Grimme) نامی جرمن مستشرق نے جو عربی کا اسکالر تھا، اسلام اور آنحضرتؐ پر دو کتابیں لکھیں جو ۱۸۹۲ء تا ۱۸۹۵ء تک طبع ہوئیں اسی نے آنحضرتؐ کی مذہبی حیثیت کو بالکل ہی ختم کر ڈالا، اور پہلی بار واضح انداز میں مطالبہ کیا کہ ساتویں صدی عیسوی کے عربیہ کا جہاں اسلام ظاہر ہوا، سماجی، معاشی اور سیاسی مطالعہ اسلام اور محمدؐ کو کما حقہ سمجھنے کے لئے لازمی ہے، اشتراکی تحریک کے ظہور سے پہلے ہی اس نے اس مکتب فکر کی بنیاد ڈال دی، اور اعلان کر دیا کہ اسلام کا ظہور و عروج محض ایک سوشلزم (Socialistic phenomenon) کا ایسا مظہر تھا، جس پر معاشی دباؤ بڑھتا جاتا تھا، یعنی اسلام کی پوری تاریخ مکہ کی طبقاتی جنگ کے اندر پوشیدہ ہے، ایک طرف سرمایہ اور محنت کی کشمکش تھی، مالدار تجار کا ظالمانہ رویہ، ملکی معیشت اور بنک پر اس کا تسلط، قبائلی قائدین کا جابرانہ سلوک تھا، دوسری طرف محنت کشوں، مزدوروں اور حرفت پیشہ لوگوں کی روز افزوں عدم قناعت و نامرادی، مایوسی تھی، انہی دونوں کے تصادم کا عکس یا مظہر اسلام ہے، یعنی اسلام امراء کے خلاف غرباء کی بغاوت تھی، اس طرح اسلام ایک دینی و مذہبی تحریک نہیں بلکہ ایک سوشل سسٹم تھا، اور محمدؐ نبی کے بجائے ایک سماجی مصلح تھے،

معاشی، سماجی تحریک میں مارگولیوتھ ۱۸۵۸ء تا ۱۹۴۰ء نے سیاسی مصالحہ لگا کر ایک نیا مثلث تیار کیا، مارکسی تحریکات کے ساتھ ساتھ جمہوریت اور آزادی کی تحریک بھی یورپ میں چل رہی تھی، لہذا اس نے اس میں سیاسی اچاد کا اضافہ بھی کر دیا، یعنی محمدؐ کی

دینی و مذہبی شخصیت کو ختم کرکے اس نے آپ کو محض ایک سیاسی مبصر اور قائد کی حیثیت دیدی، مارگولیوتھ کے خیال میں محمدؐ نے نبوت کا دعویٰ محض اس لیے کیا کہ وہ عرب پر بآسانی حکومت کر سکیں، اسی لیے وہ ایک عظیم سلطنت قائم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ نیشنل ہیرو بن گئے اور ایک مملکت کے بانی مبانی بھی اس کی تالیف محمدؐ اور عروج اسلام ان ہی خیالات کا مجموعہ ہے، مقدمہ میں وہ رقمطراز ہے کہ دین محمدؐ کی عظیم شخصیت کو تسلیم کرتا ہوں، باہم متصادم قبائل عربیہ کو ایک متحدہ ریاست میں منتقل کر دینا تھا، مشکلات کا حل، ۲۳ سالہ ملکی جدوجہد کے بعد ایک سلطنت کا قائم کرنا، پھر تخت و تاج کا مالک بن جانا، اور ایسی وسیع سلطنت کی داغ بیل ڈالنا جس کی لپیٹ میں سارا عالم آجائے، وغیرہ وغیرہ صفات غیر معمولی صلاحیت کی متقاضی تھیں، انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس میں مارگیولیوتھ کا مقابلہ بھی انہی خطوط کا عکس ہے، مگر مولف کی دریدہ دہنی حسب معمول قائم رہی۔ اپنے تحسینی کلمات کو اس نے کافور بنا دیا، جب آنحضرتؐ کو قذاق اور ڈاکو قرار دیا، مولف نے لکھا کہ مدینہ میں آنحضرتؐ کا کردار محض لیڑے قذاق کا تھا، مدینہ کی معیشت کا مدار ہی تجارتی قافلوں کے لوٹ مار پر تھا، مال غنیمت کی تقسیم میں بھی ناانصافی عام تھی، مولف آنحضرتؐ کی صداقت و اخلاص دونوں کا منکر ہے، وہ آپ کو محض ایک قانون دان جج یا ڈپلومیٹ سے زیادہ حیثیت دینے کو تیار نہیں ہے۔

اٹلی کا معروف مستشرق بیلون کیتانی ۱۸۶۷ء سے ۱۹۳۲ء Prince Leone (Caetani) بھی اسی مکتب فکر سے منسلک تھا، اس نے بھی آنحضرتؐ کی دینی شخصیت کو ختم کرنے کی سعی کی اور عربیہ کے سیاسی، سماجی اور معاشی احوال کے مطالعہ پر زور دیا جس کا مظہر اسلام تھا، اس نے اپنی تالیف اسلام Annali dell Islam میں ۶۲۲ء

کے بعد سے واقعات کو تاریخ وار درج کیا ہے، اور اسلام کی ابتدائی تاریخ سے بحث کی ہے، اپنی تالیف دراسات شرقیہ (Studi Distoris Orientale) کی تیسری جلد میں اس نے آنحضرتؐ کو محض ایک سیاسی قائد (Statesman) کی حیثیت دی ہے، اور ظہور اسلام کو عرب کے سیاسی معاشی اور سماجی اضطراب کا مظہر ثابت کیا ہے اس کے خیال میں آنحضرتؐ محض معاشی بدحالی کی بنا پر ہجرت پر مجبور ہوئے اور تحریک ہجرت کے قائد بن گئے، بطور خلاصہ مولف آنحضرتؐ کو عظیم موقع پرست سے زیادہ درجہ دینے کو تیار نہیں، اس لیے اس امر کا خاص اہتمام کیا ہے کہ محمدؐ کی دینی شخصیت کسی طرح ابھرنے نہ پائے، بلکہ ان سے ہر ممکن صرف نظر کیا جائے۔

انکار مصادر اسلامیہ اور استہزا کی تنقید کے پہلو بہلو ایک نئی تحریک نے جنم لیا، یعنی مذہبیات یا دینیات کے مطالعہ میں علم النفس کے اصول کا استعمال اور مذہبی شخصیات کا خالص نفسیاتی مطالعہ، اس کے مطابق حضرت عیسیٰؑ محض ایک انسانی ڈھانچہ بن کر رہ گئے، دینی شخصیت کی کشش جاتی رہی، دینی تحریکات کے عوامل و محرکات کا امتحان نفسیاتی اصول کے مطابق لیا جانے لگا، دراسات اسلامیہ میں جب علم النفس (سائکالوجی) اور اس کے اصول و مبادی کو نافذ کیا گیا تو اسلام کی سیاسی و معاشی تعبیرات بھی کمزور پڑنے لگیں، چونکہ اسکالر اور قاری دونوں کے منہ کا مزہ پھیکا پڑنے لگا اس لیے کسی نئے اچار یا مصالحہ کی ضرورت پڑی تو وہ مصالحہ علم النفس کا مصالحہ تھا، اسی نظریہ کو پورے اہتمام کے ساتھ آگے بڑھایا گیا، اور ظہور اسلام کے نفسیاتی عوامل و محرکات کے مطالعہ پر زور دیا گیا، اس تحریک کے سرخیل دین فرانز بجہل (Dane Frantz Buhl) اور طور اینڈرے (Tor Andrae) تھے، ان دونوں نے مذہب اور علم النفس یا مذہبی نفسیات (Religious Psychology) کی تازہ ترین

معلومات کو اسلام اور محمدؐ کے مطالعہ پر منطبق کر دیا، آنحضرتؐ کی نفسیاتی تکوینیات (Psycho mechanism) کا گہرا مطالعہ کیا گیا، بھل نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں متعدد مقالات لکھے۔

آنحضرتؐ کے اعصابی نظام (نروس سسٹم) کے گہرے مطالعہ کے بعد بھل اس نتیجہ پر پہنچا کہ غیر معمولی اعصابی (Abnormal Nervous System) سسٹم کی وجہ سے محمدؐ اپنے آپ کو دھوکہ دینے یا مغالطہ میں پڑ جانے کے عادی ہو گئے تھے، اسی دھوکہ کا نتیجہ تھا کہ محمدؐ نے یقین کر لیا کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے، محمدؐ ایک نہایت مشکوک اور مبہم (Ambiguous) کردار کے فرد تھے، جس کا سمجھنا مشکل ہے۔ وہ epileptic نہیں بلکہ hysterical تھے، وہ حقیقی مفکر تو ہرگز نہیں تھے۔

تور اینڈرے نے اسلام اور محمدؐ پر متعدد کتب لکھیں، اور سیرت و سوانح محمدؐ کے مطالعہ میں انہوں نے اپنے گہرے علم نفس کے تجارب کا استعمال کیا، بلکہ آنحضرتؐ کی شخصیت کی نفسیاتی تحلیل و تفرید میں اس نے تحلیلی نفسیات کی تکنیک Technique of Analytical Psychology استعمال کی، مولف کی نظر میں آنحضرتؐ کی عظمت کی صرف ایک دلیل ہے، وہ یہ کہ انھوں نے قدیم ادیان اور سابقہ مذاہب یعنی یہود و نصاریٰ کے مذاہب کا خلاصہ یا معجون مرکب (Synthesis) پیش کیا، چونکہ عرب کا سماجی اور معاشی نظام فرسودہ ہو چکا تھا، اس لئے روایت سے بغاوت ایک فطری ردعمل تھا، محمدؐ نے اس سے فائدہ اٹھایا، مولف اس بات پر مصر ہے کہ آنحضرتؐ اپنے اس عقیدہ میں بالکل راسخ تھے، کہ واقعی ان پر وحی نازل ہوتی ہے، عروج اسلام کا راز مولف کی رائے میں، محمدؐ کی ذہنی قوت اور صلاحیت میں مضمر تھا، مولف موصوف اسی نتیجہ پر پہنچے جو ان کے پیشرو کا محبوب موقف تھا، یعنی محمدؐ نے اسلام کی بنیاد عیسائیوں کے زیر اثر ڈالی، بیسویں صدی کے متقدمین میں یہی لوگ اساطین مستشرقین تصور کئے جاتے ہیں، ان کی پوری فہرست میں دو ایک ہی ایسے ہیں جنھوں نے خواہ مصلحتاً ہی صحیح اسلام یا محمدؐ کا دفاع

کیا ہو یا نرم الفاظ استعمال کئے ہوں، ان میں چند اسماء مثلاً کارلائل اور بوسورتھ اسمتھ قابل ذکر ہیں، آخر الذکر نے اپنی کتاب محمدؐ اور محمڈنزم میں آنحضرتؐ کے خلاف یورپ کے وحشیانہ حملوں کی مذمت کرتے ہوئے آپؐ کو ایک عظیم فرد تسلیم کیا ہے، الفونسی (Alphonse Etienne Dinet) نے ۱۹۲۰ء میں پیرس سے اپنی کتاب اللہ کے نبی محمدؐ کی حیات (The Life of Muhammad: The Prophet of Allah) شائع کی اور رواداری کا ثبوت دیا، لاطینی خرافاتی مصادر کے بجائے ابن ہشام کی سیرت رسول اللہؐ اور ابن سعد کی طبقات وغیرہ کا مطالعہ کیا، اسی طرح جے سی آرچر (J. C. Archer) نے اسپرنگر کے اسباب الامراض (Pathological School) (مذمت) کی اور کم از کم آپ کو ایک صوفی (Mystic) کی حیثیت سے تسلیم کیا، غرض مدافعت میں اسی قسم کی دو چار مثالیں مشکل سے ملتی ہیں، مگر ان میں سے کسی نے آنحضرتؐ کو دل سے نبی تسلیم نہیں کیا۔

جوں جوں ہم بیسویں صدی کے اختتام یا آخری ربع کی طرف بڑھتے ہیں مستشرقین کے رویہ میں نرمی کے بجائے شدت محسوس کرتے جاتے ہیں، بالشتی مستشرقین کا ذکر ممکن نہیں، البتہ ممتاز اساطین مستشرقین کا اثر انھوں یورپ کے اسی ذہن کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے جو اسلام کے خلاف ۱۴ صدیوں سے برسرپیکار ہے، اور لن ترضیٰ عنک الیہود ولا النصاریٰ کی نوع بہ نوع اور گوناگوں تفسیر کے مواد فراہم کرتا جا رہا ہے۔

آرنلڈ جے ٹوائن بی (۱۸۸۹-۱۹۷۵ء) (Arnold J. Toynbee) کا نام علمی حلقوں کے لیے محتاج تعارف نہیں، یہ معروف مورخ نے دنیا کے ۲۲ سے زیادہ مذاہب اور کلچر کا مطالعہ کرنے اور چالیس سالہ دیدہ ریز محنت کے بعد مطالعہ تاریخ (Study of History) کی بارہ جلدیں تحریر کیں جن میں تین ملین حروف استعمال کئے گئے ہیں مولف

خیال میں تہذیب نوی خاتمہ کے حدود پر پہنچ چکی ہے، اب صرف وقت کا انتظار ہے، (شاید تیسری عالمی جنگ وقت محدود ہو)، اشتراکی نقطہ نظر کی شدت کے ساتھ مخالفت کرتے ہوئے، مولف رقمطراز ہے کہ انسان صرف معاش یا سماج کا خلیہ نہیں، اس کی روحانی زندگی بھی ہے، اخلاقی اقدار بھی ہیں، جس کے بغیر انسان اور کیڑے میں فرق نہیں، اشتراکی مکتبِ فکر میں انسان محض سماج کا خلیہ (Cell) بنکر رہ جاتا ہے، اور اخلاقی اقدار کو روحانیات نہیں معاشیات متعین کرتی ہیں، مولف نے ثابت کیا کہ اخلاقی اقدار کا خاتمہ خدا کے ساتھ رابطہ کے اختتام کے مترادف ہے، مورخ موصوف نے اپنا نظریہ چیلنج اور رسپانس (Challenge and Response) پیش کیا، یعنی جس درجہ کا چیلنج ہو اسی درجہ کا رسپانس ہونا چاہئے، اس تناسب کی برہمی ہی زوال امت کا سبب بن جاتی ہے،

یورپ میں تاریخ کا جدلیاتی نظریہ پیش کیا گیا، یعنی ارتقا اور نمو کے لئے باہمی کشمکش ضروری ہے، اس نظریہ نے توافق للبقاء کے بجائے تنازع للبقاء کی روح پھونک ڈالی اور رقابت وحسد اور بین الاقوامی جنگوں کی بنیاد ڈال دی، بے رحمی اور سنگ دلی کا جذبہ پیدا کیا، جس کی زندہ مثالیں دو عالمی جنگیں ہیں، ٹوائن بی نے دراسات اسلامیہ اور محمدؐ کے مطالعہ میں فلسفیانہ اصول وقواعد کو کام میں لایا، مولف کے تجزیہ کے مطابق آنحضرتؐ کا رول مکہ میں روحانی رہا، مگر مدینہ میں انھوں نے روح کے ساتھ مادہ کی ایسی آمیزش کی کہ خود سکولر حاکم Secular Ruler بن بیٹھے، اور ریاست اور مذہب کو مدغم کر دیا، مورخ نے آنحضرتؐ کی سیاسی شخصیت کو ابھارنے کی سعی کی ہے، جو اس کی نظر میں اعلیٰ درجہ (First Rate) کی تھی، محمدؐ کے بارے میں مولف نے قدیمی دور کے نظریہ دغاباز یا ٹھگ اور کذاب و مکار (Imposter) کا انکار کیا ہے، مگر بطور تخمین جوہات آنحضرتؐ کے بارے میں مولف مذکور نے

پیش کی اس سے اپنے تمام تحسینی کلمات پر پانی پھیر دیا، مولف رقمطراز ہے کہ محمدؐ کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا، کہ وہ ملک عرب کے سیزر بن گئے، (جلد سوم آکسفورڈ ۱۹۳۹ء-۴۷۰-۴۶۹) کہاں مکار سیزر اور کہاں پیغمبر اسلام؟ دونوں میں کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ یہ اس عظیم ذہن کی تخمین ہے، جس نے عالمی مذاہب وثقافت کا مطالعہ کیا، اور جس کی شخصیت میں بیسویں صدی کے ۳ ربع حصے ڈوب گئے، اور جو عالمی حوالجات کا مصدر بن گیا۔

دوسرا عظیم نامی گرامی مستشرق بلاشیر اس نے ایک نیا فتنہ کھڑا کیا، یعنی آنحضرتؐ کی سوانح پر بحث کرنے کے بجائے، مصادر سیرت پر بحث شروع کی اور اعلان کر دیا کہ ان مصادر کو اس وقت تک استعمال نہیں کیا جا سکتا ہے، جب تک جدید تنقید کے تکنیکی اصول ان پر منطبق نہ کرلئے جائیں، یہ سازش واضح طور پر اس بات کی دعوت تھی کہ مصادر اسلامیہ جدید تنقیدی اصولوں پر نہ تو اتریں گے نہ انکی ثقاہت ثابت ہو سکے گی، یہ وہی پرانی شراب نئے جام میں ڈھالی گئی۔

نصف آخر بیسویں صدی کی اہم خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ہمہ وقت وہمہ دم (Full time) اسلامی اسکالر وجود میں آگئے، یعنی ان مستشرقین نے دراسات اسلامیہ ہی کو اپنا پیشہ career بنالیا، اس لئے کہ مغربی جامعات، انسٹی ٹیوٹ اور مراکز بحث وتحقیق میں اسلام کے مختلف سیاسی معاشی دینی وثقافتی پہلوؤں پر تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع ہوا، اور بڑے بڑے مطابع اور اشاعتی ادارے (Publishers) ہر چھ ماہ کے وقفہ پر مستشرقین کے دروازوں پر دستک دینے لگے کہ آیا اسلام کے متعلق (یعنی اسلام کے خلاف) کوئی تازہ ترین تالیف برائے اشاعت تیار ہے؟

(یہ بات راقم الحروف سے ایک عالمی شہرت کے نامی گرامی مستشرق نے امریکہ میں بتائی اور یہ بھی بتایا کہ وہ اس روش سے نالاں ہیں، آخر ہر چھ ماہ پر کوئی مولف کیسے کتاب لکھ سکتا ہے")

یعنی تجارتی اور کمرشیل مفادات نے بھی اسلام کے خلاف لٹریچر کی اشاعت میں بڑا حصہ لیا، عالمی مواصلات بڑھتے گئے، دنیا سمٹتی گئی، اور سارا عالم جام جمشید کی طرح کوزہ میں بند ہوگیا، دوسری عالمی جنگ کے بعد عالم اسلام استعمار کے پنجہ استبداد سے آزاد ہوا، آزادی کی نئی لہر پھیلی ایک طرف اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لئے مفکرین اسلام مثلاً سید قطب، مولانا مودودی، اور مولانا سید ابوالحسن ندوی وغیرہ کے قلم کے تیر برسنے لگے، دوسری طرف مستشرقین کو اپنی بساط کے الٹ جانے کا اندیشہ ہونے لگا۔

مغربی جامعات میں یہود و نصاریٰ کا بڑا گروہ جو درحقیقت مشنری اسکولوں کا پروردہ اور تربیت یافتہ تھا، قلم لیکر اسکالرشپ کے میدان میں کود پڑا، فرداً فرداً سب کا ذکر محال ہے۔ البتہ ممتاز نمائندوں کا سرسری جائزہ نفسیات غرب اور استشراق کو سمجھنے میں مدد دے سکتا ہو تاکہ ان تر ضی کی تفسیر مزید واضح ہو سکے،

بیسویں صدی کے نصف آخر کا عظیم ترین مستشرق سر ہملٹن گب ...... کو سمجھا جاتا ہے، جنکا نام مسلمان اور مستشرقین دونوں بڑے احترام کے ساتھ لیتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ ان کی لیاقت، وسعت نظر مطالعہ اور طرز نگارش میں کوئی دوسرا سبقت نہیں لے جا سکا، موصوف امریکی جامعہ میں راقم الحروف کے شعبہ کے صدر الصدور بھی تھے، وصال سے پہلے آکسفورڈ میں سن ۱۹۷۰ء کی آخری ملاقات میں راقم سطور نے کافی وقت مرحوم کے ساتھ صرف کیا، علالت کے باوجود جس محبت اور جوش وخروش کے ساتھ وہ پیش آئے، لائق صد تحسین وستائش ہے، خاصکر بیگم قدسیہ کے ساتھ حسن سلوک کا نادر نمونہ پیش کیا اس مرض کی حالت میں اپنے علمی کارناموں تحریری نسخوں اور خاصکر عربی خوشخطی کے جو نمونے دکھائے اور دوسری عالمی جنگ کے دوران لکھے ہوئے عربی مقالات ومضامین کا جو مجموعہ دکھایا وہ

لائق حیرت ضرور تھا، ان تمام اخلاقی محاسن کا ہر فرد معترف ہوگا خواہ وہ کسی بھی مذہب اور مسلک کا ہو، مگر اسلام کے بارے میں ایک ایسے روشن خیال عالم اور مستشرق نے کیا کیا تھا اس کا جواب نفی میں ہی دیا جا سکتا ہے، صرف دو ایک مثالیں کافی ہیں، موصوف کی کتاب محمڈنزم (سنہ ۱۹۶۲ء) خود بدمذاقی کا عظیم ثبوت ہے، اگرچہ اب اس کا نام اسلام رکھدیا گیا ہے، مگر مولف کے مضامین اظہر من الشمس ہیں، اپنی معروف تالیف اسلام میں جدید رجحانات ۱۹۴۷ء modern trends in Islam میں اسلام کے بارے میں بے حد دلسوز باتیں تحریر کی ہیں، چھٹے باب میں اسلام اور اس کے عالمی اثرات سے بحث کرتے ہوئے موصوف رقمطراز ہیں کہ اسلام درحقیقت محمدؐ کے جذباتی مغلوبیت کا ایک ہیجانی دین (Emotional Cult) تھا، جدید رجحانات کے اثرات سے بحث کرتے ہوئے مولف نے لکھا ہے کہ خدا کا شکر ہے کہ جدید معقول دینیات Rational Theology اب محمدؐ کے ہیجانی دین (Emotional Cult) پر غالب آگئی ہے یعنی جدت قدامت پر اور بغاوت روایت پر غالب آگئی ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ عالم اسلام میں مسلم حکمرانوں اور روشن خیال مغربی تعلیم یافتہ افسران کے ہاتھوں جو اسلام کشی کی تحریک ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ محمدؐ کا جذباتی مذہب اب عقلیت سے تبدیل ہوتا جا رہا ہے، مولف یورپ کی بدقسمتی پر نوحہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یورپ کی روحانی تحریک اسی جذباتی مذہب کے زیر اثر عربی ادبیات کے ذریعہ میڈیول دور میں یورپ پہنچی پھر اٹھارویں صدی میں الف لیلہ وغیرہ کے ذریعہ جذباتیت کا آسیب یورپ کے سر پر سوار ہوگیا، برصغیر ہند و پاک کی اسلامی تحریکات اور تحریک تجدید سے بحث کرتے ہوئے مولف علی گڈھ اسکول اور سر سید کی تعریف کرتے ہیں، ساتھ ہی غلام احمد بانی قادیانیت اور قادیانی تحریک کی زوردار حمایت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ اسلام میں احمدیہ تحریک نے ہی

تحریک تجدید کو آگے بڑھایا، ایک نئے مذہب کو وجود میں لایا، اور رواداری کے ساتھ تحریک اصلاحات پر زور دیا، جو لوگ قدیم اسلام میں عقیدہ کھو چکے تھے، ان میں تازہ ایمان پیدا ہوا، علامہ محمد اقبال کسی بھی مسلم قاری کے لیے محتاج تعارف نہیں، نہ ہی کوئی تعلیم یافتہ علامہ کی اسلام دوستی یا فکر و نظر اور مغربی تہذیب پر نقد و جراحت سے ناواقف ہے۔

پروفیسر گب علامہ اقبال کو مجموعۂ اضداد قرار دیتے ہوئے ان کی معروف تصنیف کی دھجیاں اڑاتے ہیں اور اقبال کو مجموعہ تضاد mass of Contradiction قرار دیتے ہیں، معروف فرانسیسی مستشرق رینان Rennan نے اسلام کو معقولیت یا عقلیت کا ناقابل علاج دشمن Incurable enemy of Islam بتایا تھا، پروفیسر گب نے اسلام کو تاریخی افسانہ یا جھوٹ Historical Romance سے تعبیر کیا، جس میں معقولیت کا عنصر کم ہے اور تخئیل کا عنصر زیادہ ہے، اور ظاہر ہے کہ تخئیل کی زندگی عقلیت کے مقابلہ میں مختصر ہوتی ہے، اسی لئے اسلام جلد زوال پذیر ہوا۔ (باقی)

مقالات سلیمان جلد دوم

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے دینی و علمی اور تحقیقی و تاریخی مضامین کی اب تک تین جلدیں شائع ہوئی ہیں، اس سلسلہ کی دوسری جلد نہایت اہم اور معرکۃ الآرا مضامین کا مجموعہ ہے، جن میں حدیث و سنت پر مستشرقین یورپ کے اعتراضات کے نہایت عالمانہ اور مدلل جواب دیے گئے ہیں، اور حدیث و رجال حدیث کے بارہ میں ان کی ہرزہ سرائیوں اور اغلاط و مسامحات کی نشاندہی کی گئی ہے اور ان کی پیدا کردہ غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے،

قیمت :- ستره روپیے ۔ ۱۷ منیجر

سعدی شیرازی کی ولادت کے سلسلے کی چند داخلی شہادتوں کا تجزیہ

از پروفیسر نذیر احمد علی گڈھ

شیخ سعدی شیرازی باوجود اپنے فضل و کمال کے اس لحاظ سے بڑے بدقسمت تھے کہ ان کے اجزاے زندگی کی بیشتر کڑیاں ہنوز غیر مربوط ہیں، اگرچہ خود ان کے کلام میں ایسے اشارے موجود ہیں، جن کی مدد سے ان کے حالات زندگی مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن بعض اشارے مبہم ہیں، چنانچہ ان کو غلط نتیجے پر پہنچنے کا بخوبی امکان ہے، اور تو اور خود ان کے نام کا مسئلہ حد درجہ اختلاف آرا ہے،[1] اور ان کی پیدائش کی تاریخ ایک مسئلہ لاینحل بن کر رہ گئی ہے، اس سلسلے میں سیکڑوں محققین نے کوششیں کیں لیکن ہنوز کسی خاص نتیجے پر پہنچنے میں کامیابی نہیں ہو سکی ہے، راقم الحروف کا یہ مقالہ سعدی کی ولادت کے سلسلے کے بعض داخلی اشارات پر تحقیقی نظر ڈالنے کی ایک کوشش ہے،

شیخ کی ولادت کے تعلق سے داخلی شہادتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، اوّل وہ شہادتیں ہیں، جن سے سعدی کی پیدائش ساتویں صدی کے اوائل (یعنی پہلے دہے) میں قیاس کی جا سکتی ہے، دوسری وہ شہادتیں ہیں، جن سے ان کی ولادت کا زمانہ چھٹی صدی کے آخری ربع کے قریب فرض کیا جاتا ہے، پہلے سلسلے کی شہادتیں یہ ہیں۔

۱- گلستان و بوستان میں بعض اشارے ہیں، جن سے ان کتابوں کی تالیف کے وقت شیخ کی عمر پچاس ۵۰ سال کے قریب ہوگی۔

۲- سعدی کے کلام میں بعض ایسے سلاطین و امرا وغیرہ کی مدح ہے، جو وسط ساتویں صدی کے ہیں، چھٹی صدی کے امرا و صدور و سلاطین کی مدح سے ان کا کلام عاری ہے۔

---

[1] مختلف منابع میں سعدی کے یہ نام ملتے ہیں، مصلح الدین، ابو عبد اللہ بن مشرف بن مصلح بن مشرف، مشرف الدین مصلح، شرف الدین مصلح الدین بن مشرف، مشرف بن مصلح، مصلح الدین سعدی وغیرہ۔

۳۔ اتابک تکلا بن زنگی (۵۷۱ھ تا ۵۹۴ھ) کا شمار شاہان پیشینہ میں کیا گیا ہے۔

۴۔ شیخ جمال الدین ابوالفرج بن الجوزی کی نصیحت و تربیت جس کا ذکر گلستان کی ایک حکایت میں ہے۔

دوسرے سلسلے کی شہادتیں یہ ہیں۔

۱۔ خوارزم شاہ اور خان ختائی صلح کے موقع پر سعدی کی جامع کاشغر میں موجودگی۔

۲۔ اغلمش فرماں روائے بلاد جبال (یعنی رے، ہمدان، اصفہان مع ان کے مضافات کے) عہد حکومت میں سعدی کی ہمدان یا اصفہان میں موجودگی۔

ان داخلی شہادتوں کے علاوہ کچھ شہادتیں ایسی ہیں، جن پر ان کی تاریخ ولادت کا کوئی اثر نہیں پڑتا، مثلاً ان کی ملاقات شیخ شہاب الدین ابو حفص سہروردی صاحب عوارف المعارف (م ۶۳۲ھ) سے بوستان کی ایک حکایت کے اشعار[1] ملاحظہ ہوں۔

مقامات مردان بمردی شنو	نہ از سعدی از سہروردی شنو
مرا شیخ دانائے مرشد شہاب	دو اندرز فرمود بر روی آب
یکی آنکہ در جمع بدبین مباش	دوم آنکہ در نفس خودبیں مباش
شنیدم کہ بگریستی شیخ زار	چو برخواندی آیات اصحاب نار
شبی دانم از ہول دوزخ نخفت	بگوشم آمد صبحگاہی کہ گفت
چہ بودی کہ دوزخ زمن پُر شدی	مگر دیگران را رہائی بدی
کسی گوی دولت ز میدان ربود	کہ در بند آسایش خلق بود

شیخ شہاب الدین سہروردی کی وفات ۶۳۲ھ میں ہوئی، واضحاً اس تاریخ سے

[1] کلیات سعدی ص ۲۶۳۔

کافی پہلے سعدی شیخ کی صحبت میں رہ چکے تھے، لیکن اشعار کا تقاضا ہے کہ سعدی اس موقع پر بالکل نوجوان نہ ہوں گے، بلکہ اگر عمر رسیدہ بھی ہوں تو بھی اس کی تکذیب ان اشعار سے نہیں ہو سکتی، بہرحال یہ واقعہ ایک جوان کی طرف منسوب ہو سکتا ہے، اور ایک عمر رسیدہ کی طرف بھی، اس سے سعدی کی عمر کا قیاس درست نہ ہوگا۔

دوسری دو اور شہادتوں کا ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔ گلستان کی ایک حکایت سے بعض جگہ استدلال کیا گیا ہے کہ سعدی شیخ عبدالقادر جیلانی[1] سے مکہ میں مل چکے تھے، شیخ کی وفات ۵۶۱ھ میں ہوئی، اس بنا پر سعدی کی ان سے ملاقات مستبعد نظر آتی ہے، دراصل اس قیاس کی بنیاد گلستان کی غلط قرأت پر ہے۔ "عبدالقادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ را دیدم" درست نہیں ہے۔ دیدند درست ہے، اس سے اس واقعہ کا انتساب سعدی سے نہیں ہو سکتا۔

و بوستان کے مطبوعہ نسخوں[2] میں ایک اور واقعہ اس طرح درج ہوا ہے۔

اگر گوش دار د خداوند ہوش	سخنہائے پیر خوش آید بگوش
سفر کردہ بودم ز بیت الحرام	در ایام ناصر بدار السلام
شبی رفتہ بودم بگنجی فراز	بچشمم درآمد سیاہی دراز
در آغوش او دختری چون قمر	فرو بردہ دندان بلبہاش در
مرا امر معروف دامن گرفت	فضول آتشی گشت در من گرفت
طلب کردم از پیش و پس چوب و سنگ	بر آن ناخدا ترس بی نام و ننگ
ز لاحولم آن دیو ہیکل بجست	پری پیکر اندر من آویخت دست
کہ ای زرق سجادہ و دلق پوش	سیہ کار دنیا خر دین فروش

[1] کلیات ص ۱۱۰ [2] کلیات ص ۳۸۱، ۳۸۸

مرا سالہا دل زکف رفتہ بود | بر این شخص وجان بروی آشفتہ بود
کنوں پختہ شد لقمۂ خام من | کہ گرمش بردل کردی از کام من
تظلم برآورد فریاد خواند | کہ شفقت برافتاد ورحمت نماند
نماند از جوانان کسی دستگیر | کہ بستاندم داد ازین مرد پیر
کہ قہرمش نیاید زپیری ہمی | زند دست در سترِ نامحرمی

پہلے دو اشعار سے واضح ہے کہ اس حکایت کا تعلق سعدی سے ہے، اور وہ خلیفہ ناصر باللہ متوفی سنہ ۶۲۲ھ کے دور میں بیت الحرام سے، دارالسلام یعنی بغداد گئے تھے، اور اسوقت وہ خاصے سن رسیدہ پیر ہو چکے تھے، اگر ان کی عمر اس وقت ۵۰ سال کی بھی فرض کی جائے تو ان کی پیدائش سنہ ۵۷۰ھ سے کافی قبل قرار پاتی ہے، لیکن ان دونوں اشعار کی صورت بعض نسخوں میں مختلف ہے، مثلاً کلیات سعدی کے پیرس کے نسخے میں (کتب خانہ کی (Bapp. Per 1779) جو ۸۶۷ھ کا مکتوبہ ہے) یہ اشعار اسطرح منقول ہیں،

چنیں گفت پیری پسندیدہ ہوش | سخنہاے پیران خوش آید بگوش
سفر کردہ بودم زبیت الحرام | در ایام ناصر بدار السلام
شبی رفتہ بودم بکنجی فراز | بچشمم در آمد سیاہی دراز

مسلم یونیورسٹی کے ایک نسخہ میں جسکی کتابت سنہ ۸۱۴ھ کی ہے صرف دو اشعار اسطرح پر ہیں،

چنیں گفت پیری پسندیدہ ہوش | خوش آید سخنہای پیران بگوش
کہ در مصر رفتم بکنجے فراز | چہ دیدم در انجا سیاہی دراز

کلیات سعدی، مطبوعہ تہران سنہ ۱۳۳۶ میں بھی دو ہی شعر ہیں،

چنیں گفت پیری پسندیدہ ہوش | خوش آید سخنہاے پیراں بگوش
کہ در ہند رفتم بکنجی فراز | چہ دیدم چو یلدا سیاہی دراز

گویا آخری دونوں نسخوں میں پیرس کے نسخے کی دوسری اور تیسری بیت کو ملاکر

ایک ہی بیت کر لیا گیا ہے، تہران والے نسخے میں ہندوستان جانے کا ذکر ہے، جب کہ علی گڑھ کے قلمی نسخے میں مصر جانے کا گو ناصر خلیفہ کا نام نہیں آیا، بہرحال ان تینوں نسخوں سے اس بات کا تعین ہو جاتا ہے، کہ اس حکایت کا تعلق سعدی کی ذات سے نہیں، اس بنا پر اس سے ان کی تاریخ پیدائش کا استدلال نہیں ہو سکتا۔

اب میں ان شہادتوں کا ذکر کروں گا، جن سے سعدی کی ولادت اوائلِ قرن ہفتم قرار پاتی ہے، گلستان کے دیباچے میں ہے۔

یک شب تامل ایام گذشتہ می کردم و بر عمر تلف کردہ تاسف می خوردم وسنگ سراچۂ دل بہ الماس آب دیدہ می سفتم وایں بیتہا مناسب حال خود میگفتم :-

ہر دم از عمر می رود نفسی | چو نگہ میکنم نماند بسی
ای کہ پنجاہ رفت ودر خوابی | مگر ایں پنج روز دریابی

اگرچہ عباس اقبال آشتیانی ان اشعار کو بعینہٖ سعدی کی زندگی سے مربوط نہیں مانتے، مگر ذبیح اللہ صفا کا خیال ہے کہ چونکہ خود سعدی نے ان اشعار کو مناسب حال کہا ہے، اس لیے ان سے ان کی ولادت کا قیاس کیا جا سکتا ہے، اس اعتبار سے انکی پیدائش سنہ ۶۰۶ھ کے قریب ہوگی، اس لیے گلستان کی تاریخ تالیف سنہ ۶۵۶ھ ہے۔[1]

بوستان میں باب نہم اس طرح شروع ہوتا ہے۔

بیا ای کہ عمرت بہفتاد رفت | مگر خفتہ بودی کہ برباد رفت
ہمہ برگ بودن ہمی ساختی | بتدبیر رفتن نپرداختی
قیامت کہ بازار مینو نہند | منازل بہ اعمال نیکو دہند

---

[1] کلیات ص ۳۰۷۔

بضاعت بچند آنکہ آری بری	وگر مفلسی شرم ساری بری
کہ بازار چندانکہ آگندہ تر	تہیدست را دل پراگندہ تر
ز پنجہ درم پنج اگر کم شود	دلت ریش سرپنجۂ غم شود
چو پنجاہ سالت برون شد ز دست	غنیمت شمر پنج روزی کہ ہست
اگر مردہ مسکین زبان داشتی	بفریاد و زاری فغان داشتی
کہ اے زندہ چون ہست امکان گفت	لب از ذکر چون مردہ برہم مخفت
چو ما را بغفلت بشد روزگار	تو باری دمی چند فرصت شمار

اگرچہ اکثر لوگوں نے۔۔۔ ان اشعار کو سعدی کی زندگی سے مربوط نہیں بتایا ہے لیکن اگر ابتدائی اشعار کو محض ناصحانہ سمجھا جائے، جن میں ایک ستر سالہ سن رسیدہ آدمی کو خطاب کیا گیا ہے، تو اس کا دوسرا جز جس میں پچاس سال بے توجہی و بے عملی میں گذر جانے پر عمر کا جو مختصر حصہ بچا ہے، اس میں عمل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، سعدی کی طرف منسوب ہو سکتا ہے، اس لئے کہ بوستان گلستاں سے ایک ہی سال قبل یعنی ۶۵۵ھ میں نظم ہوئی اس وقت وہ اپنی عمر کے پچاسویں سال میں ہوں گے۔

ان امور کے ساتھ یہ بات بھی پیش نظر رکھنے کی ہے کہ سعدی نے ان دونوں تصانیف میں کہیں بھی ان کی پیرانہ سالی کا ذکر نہیں کیا گلستاں باب ہشتم ضعف و پیری پر ہے، مگر اس میں انھوں نے اپنی پیری کا ذکر نہیں کیا اسکے برخلاف اسکی بعض حکایتوں میں انکی جوانی کا واقعہ درج ہے مثلاً

وقتی بجہل جوانی بانگ بر مادر زدم الخ (کلیات ص ۱۶۷)

روزے بغرور جوانی سخت راندہ بودم۔ الخ (ص ۱۷۵)

جوانی چست و لطیف خندان و شیرین زبان در حلقۂ عشرت ما بود الخ (ص ۱۶۷)

خلاصہ یہ کہ گلستان یا بوستان کی تالیف کے وقت سعدی کی پیرانہ سالی ثابت نہیں۔

سعدی کے کلام میں کسی ایسے ممدوح کی مدح نہیں جو ساتویں صدی ہجری کے قبل کا ہو[1]، ان کے مخصوص مدوحین میں شیراز کے فرماں روا تھے، ان میں اتابک ابوبکر بن سعد بن زنگی (م ۶۵۸) اتابک سعد بن ابوبکر بن سعد (م ۶۵۸)، محمد بن سعد بن ابوبکر (۶۵۸ تا ۶۶۰)، سلجوق شاہ ابن سلغر (۶۶۱ - ۶۶۲)، آبش خاتون دختر سعد بن ابوبکر منکوحہ منکو تیمور بن ہلاکو (۶۶۲-۶۶۳) قابل ذکر ہیں، اور تعجب یہ ہے کہ اتابک سعد بن زنگی (۵۹۴ھ تا ۶۲۳ھ) کی مدح سے سعدی کا کلام خالی ہے، البتہ بوستاں میں ایک دوسرے شخص کے حوالے سے اس کی وفات کے بعد ایک واقعہ درج کیا ہے، جو اس طرح ہے۔

---

[1] ذبیح اللہ صفا (تاریخ ادبیات ج ۳ ص ۵۹۰) لکھتے ہیں، «حال آنکہ سعدی از رجالی در آثار خود یاد کردہ و با آنان ارتباط داشتہ کہ ہمہ اواسط قرن ہفتم می زیستہ اند و چنانکہ در متن گفتہ ایم در ہیچیک از آثار منظوم و منثور او ستایشی از سعد بن زنگی و اشارہ ای دیدہ نمی شود کہ حاکی از ارتباط وی با آن اتابک در حال حیات باشد»

اسی طرح عباس اقبال آشتیانی، مقدمۂ گلستان میں فرماتے ہیں۔

«در سراسر کلیات سعدی نام و مدح ہیچیک از امرا و حکام و سلاطین فارس یا غیر فارس قبل از دورۂ اخیر سلطنت اتابک مظفر الدین ابوبکر بن سعد بن زنگی (۶۲۳ - ۶۵۸) نیست در صورتیکہ بر خلاف بعد از این تاریخ سعدی ۶۵۰ یعنی قریب دہ سال پیش از وفات شیخ تمام اتابکان سلغری و اکثر امرا و حکام مغول در فارس در کلیات دیدہ می شوند۔» [2] اتابک سعد اتابک تکلہ بن زنگی کے بعد تخت نشین ہوا، تکلہ کی تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے، شیراز نامہ میں ۵۹۰ھ ہے، لیکن صحیح ۵۹۴ھ ہے اس لئے کہ خود شیراز نامہ میں اس کی مدت حکومت ۲۹ سال درج ہے جو ۶۲۳ھ میں پوری ہوتی ہے، میرزا محمد قزوینی نے شد الازار (تعلیقات و حواشی) میں یہی تاریخ یعنی ۵۹۴ درج کی ہے، لیکن صفا نے ۵۹۹ھ لکھی ہے، [3] کلیات سعدی مطبوعہ تہران ۱۳۲۶ ص ۱۳۰۲

ثنا گفت بر سعد زنگی کسی — کہ بر تربتش باد رحمت بسی

درم داد و تشریف و بنواختش — بمقدار خود منزلت ساختش

چو اللہ بس دید بر نقش زر — بشورید و بر کند خلعت ز بر

ز سوزش چنان شعلہ در جان گرفت — کہ برجست و راہ بیابان گرفت

یکی گفتش از ہم نشینانِ دشت — چہ دیدی کہ حالت دگرگونہ گشت

تو اول زمین بوسہ دادی بجائے — نبایستی آخر زدن پشت پای

بخندید کاول ز بیم و امید — ہمی لرزہ بر تن فتادم چو بید

باخر ز تمکین اللہ بس — نہ چیزم بچشم اندر آمد نہ کس

سلسلۂ اول کی شہادتوں میں ایک نہایت اہم شہادت یہ ہے کہ بوستان میں سعدیؒ نے اتابک تکلہ کو شاہانِ پیشین میں شمار کیا ہے، اور اس کے متعلق جو قول نقل کیا ہے، اس کی بنیاد "اخبار پیشینہ"[1] ہے،

در اخبار شاہانِ پیشینہ ہست — کہ چون تکلہ بر تختِ زنگی نشست

بدورانش از کس نیازرد کس — سبق برد اگر خود ہمین بود و بس

چنین گفت یک ره بصاحب دلی — کہ عمرم بسر رفت بی حاصلی

بخواہم بکنج عبادت نشست — کہ دریابم این پنج روزی کہ ہست

چو می بشنود روشن دل و مرید — نبرد از جہان دولت الا فقیر

چو بشنید دانای روشن نفس — بتندی برآشفت کی تکلہ بس

طریقت بجز خدمتِ خلق نیست — بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

۱؎ کلیات سعدی، مطبوعہ ۱۳۳۷، ص ۲۲۰

تو بر تختِ سلطانیِ خویش باش — بہ اخلاق پاکیزہ درویش باش

بصدق و ارادت میان بستہ دار — ز طاعت و دعوی زبان بستہ دار

قدم باید اندر طریقت نہ دم — کہ اصلی ندارد دم بی قدم

بزرگان کہ نقد صفا داشتند — چنین خرقہ زیر قبا داشتند

اتابک تکلہ اپنے باپ اتابک زنگی کی وفات[1] پر ۵۷۱ھ میں تخت نشین ہوا، اور ۲۳ سال حکومت کرنے کے بعد ۵۹۴ھ میں فوت ہوا، غور طلب بات ہے کہ جو بادشاہ شیراز کے تخت پر ۵۷۱ھ تا ۵۹۴ھ متمکن رہا ہو، اس کا شمار شاہانِ پیشینہ میں ہو، اور اس کے احوال کے مآخذ اخبار شاہانِ پیشینہ ہوں، اس سے واضح ہے کہ سعدی نے اس کا زمانہ نہیں پایا تھا۔

شیخ سعدی نے گلستان کی ایک حکایت[2] میں شیخ اجل ابو الفرج بن جوزی کا ذکر اس طرح کیا ہے،۔

چندانکہ مرا شیخ اجل ابو الفرج بن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ ترک سماع فرمودی وبخلوت و عزلت اشارت کردی عنفوان شبابم غالب آمدی و ہوا و ہوس طالب ناچار بخلاف رای مربی قدمی برفتمی، و از سماع و مجالست حظی برگرفتمی و چون نصیحت شیخم یاد آمدی گفتمی۔

قاضی ار با ما نشیند برفشاند دست را — محتسب گر می خورد معذور دارد مست را الخ

اس سے بعض محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شیخ ابو الفرج بن جوزی سے مراد شیخ جمال الدین ابو الفرج عبد الرحمٰن بن الجوزی صاحب کتاب المنتظم وکتاب ۔۔۔۔ لیا گیا

۱؎ شیراز نامہ ص ۴۴، ۲؎ کلیات سعدی، ص ۱۱۷

وتلبیس ابلیس وغیرہ ہیں، اور اس لحاظ سے سعدی کی پیدائش قرن ششم کے وسط میں ہوئی ہوگی لیکن بعض اہم محققین[1] کے نزدیک اس حکایت میں شیخ ابوالفرج بن الجوزی کے پوتے مراد ہیں، جن کا لقب کنیت اور نام سب دادا ہی کے ہیں، یعنی وہ بھی ابوالفرج عبدالرحمٰن بن الجوزی تھے، جو اپنے والد یعنی محی الدین یوسف بن جمال الدین عبدالرحمٰن بن الجوزی اول، اور بھائیوں یعنی شرف الدین عبداللہ وتاج الدین عبدالکریم کے ساتھ فتح بغداد کے موقع میں یعنی ۶۵۶ھ میں قتل کر دیے گئے، گلستان بھی عین ان ہی تاریخوں میں یعنی ۶۵۶ھ میں تالیف ہوئی، ان لوگوں کا یہ استدلال چند امور پر مبنی ہے، اول یہ کہ سعدی کی پیدائش اواسط چھٹی صدی میں قیاس کرنے سے اس بات کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی کہ ان کے کلام میں چھٹی صدی کے امراء وصدور کی مدح کیوں نہیں، دوم یہ کہ اس سے سعدی کی عمر سو سال سے کافی زیادہ ہو جاتی ہے، جس کے لئے کوئی قوی قرینہ نہیں، سوم یہ کہ حکایت مذکور میں سعدی نے محتسب کی تعریف کی ہے، یہ شیخ کے محتسب ہونے پر دلالت کرتا ہے، اور شیخ ابوالفرج بن الجوزی دوم ۶۳۳ھ سے بغداد کے عہدہ احتساب پر فائز تھے، اور المحتسب کے لقب سے بھی اکثر پکارے جاتے تھے[2]، چنانچہ حوادث الجامعہ ص ۵۵، ۳۲۰ میں کئی بار ان کا لقب المحتسب ذکر ہوا ہے۔

اب میں چند ایسے امور کا ذکر کروں گا جن سے سعدی کی پیدائش اواسط چھٹی صدی یا اس کے کچھ ہی بعد پر بخوبی استدلال ہو سکتا ہے،

---

[1] یعنی میرزا محمد قزوینی (دیکھئے نامہ ہائے قزوینی و حواشی جہانگشائے جوینی ج ۳ ص ۳۶۳ تا ۳۶۴) وعباس اقبال (روزنامۂ ایران سال ۱۳۱۱) ومقدمہ کلیات سعدی (گلستان) و ذبیح اللہ صفا (تاریخ ادبیات در ایران ج ۳ ص ۵۹) [2] ابوالفرج عبدالرحمٰن بن الجوزی کے حالات کے لیے دیکھئے تعلیقات جہانگشائی جوینی ج ۳ ص ۳۶۳ تا ۳۶۶۔

سعدی نے گلستان کے باب پنجم میں ایک حکایت لکھی ہے کہ جس سال محمد خوارزم شاہ اور خان ختان میں صلح ہوئی، وہ کاشغر کی مسجد جامع میں تھے، وہاں ایک خوبصورت لڑکا مقدمہ نحو زمخشری پڑھتا تھا، اور اس میں سے اس ٹکڑے کی تکرار کرتا تھا۔

ضرب زیدٌ عمرواً وکان المتعدی امراً

سعدی بول اٹھے کہ خوارزم شاہ اور خان ختا میں صلح ہو گئی، اور زید عمر کی دشمنی برقرار ہے، لڑکا مسکرایا اور ان کا وطن دریافت کیا، سعدی کے شیراز بتانے پر وہ بول اٹھا کہ ان کو سعدی کے کچھ اشعار یاد ہوں گے، اس پر انھوں نے عربی کے دو شعر پڑھے، لڑکا بولا سعدی کے اکثر اشعار فارسی کے ہیں، پھر سعدی نے یہ دو شعر پڑھے

طبع ترا تا ہوس نحو کرد	صورت صبر از دل ما محو کرد
اے دل عشاق بدام تو صید	ما بتو مشغول وتو با عمرو زید

سلطان محمد خوارزم شاہ سے مراد سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ بن تکش ہے، جو بڑا فاتح جوانمرد اور صاحب حوصلہ حکمران تھا، وہ ۵۹۶ھ میں تخت نشین ہوا، اور چند ہی دنوں میں سارے ایران، توران کے حکمرانوں کو اپنا مطیع بنا لیا، ۶۱۵ھ میں اس کی فتوحات کا دائرہ قطب شمالی تک پہنچ گیا، لیکن ان ہی ایام میں چنگیز خاں اس پر حملہ آور ہوا، سلطان محمد اس کا مقابلہ نہ کر سکا، اور ۶۱۷ھ میں جزیرہ آسکون میں فوت ہو گیا۔

سعدی[1] نے اپنی حکایت میں محمد خوارزم شاہ کی خان ختا سے صلح کا ذکر کیا ہے، تاریخوں سے ثابت ہے کہ خوارزم شاہ نے ۶۰۶ھ میں ختا کے فرمانروا قوریخ خاں پر حملہ کیا، ختا کے لشکر کا سردار تاینکو طراز تھا، وہ بڑا دلیر تھا، کہتے ہیں اس نے ۴۵ لڑائیاں سر کی تھیں، مگر وہ خوارزم شاہ سے

---

[1] کلیات ص ۱۶۵-۱۶۶ [2] مزید تفصیل کے لیے دیکھئے طبقات ناصری مطبوعہ کابل ج اول و ترجمہ جہانگشائی راورٹی ج ۱ ص ۲۶۳-۲۶۴

شکست کھا گیا، گرفتار ہوا، اور سلطان محمد کے ہاتھ پر مسلمان ہوا، دوسرے سال سلطان محمد پھر خطا کی طرف متوجہ ہوا، گورخاں جو خاقان اعظم تھا، اس کے مقابلے کے لئے آیا، مگر اس نے شکست کھائی، اس طرح خطا کا پورا علاقہ محمد خوارزم شاہ کے قبضۂ اقتدار میں آگیا، اس تفصیل سے واضح ہے کہ سعدی سنہ ۶۰۶ھ اور سنہ ۶۱۰ھ کے نزدیک کاشغر میں تھے، اس وقت وہ اتنے کہنہ مشق شاعر ہو چکے تھے کہ بلاد اسلامیہ کے دور دراز علاقوں تک میں بچہ بچہ ان سے واقف ہو چکا تھا، اس حقیقت کے پیش نظر ان کی عمر ۴۰ سال سے کم نہ ہونی چاہیئے، اس طرح ان کی تاریخ پیدائش سنہ ۵۶۶ھ کے حدود میں ثابت ہوتی ہے،

ایک دوسرا واقعہ جو گلستان[1] باب اول میں مذکور ہے وہ سلطان اغلمش سے تعلق رکھتا ہے، جیسا کہ حسب ذیل حکایت مظہر ہے۔

سرہنگ زادۂ را بر در سرائے اغلمش دیدم کہ عقل و کیاستی و فہم فراستے زاید الوصف داشت، ہم از عہد خردی آثار بزرگی در ناصیۂ او پیدار

بالائے سرش ز ہوشمندی		می تافت ستارۂ بلندی

بالآخر وہ بادشاہ کا پسندیدہ ہوا، اس لئے کہ وہ ظاہری و باطنی کمال کا مجموعہ تھا، کچھ ہی دن بعد حاسدوں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا، اس کو خیانت سے منسوب کیا لیکن وہ بچ گیا، بادشاہ نے پوچھا کہ اس جماعت کی دشمنی کا کیا سبب ہے، اس نے کہا کہ آپ کے اقبال کے سایہ میں سب کو راضی کر دیا، مگر حسود تو سوائے میرے عزت و حرمت کے ختم کیے کسی اور وجہ سے خوش ہو سکتے ہیں۔

اس حکایت میں جس بادشاہ کا ذکر ہے، وہ سلطان اغلمش ہی ہے، اور واضح ہے

---

[1] سعدی نے تاریخ ربیع اول سنہ ۶۵۶ھ لکھی ہے ص ۲۶۰-۲۶۱ ج نمبر ۲، کلیات مطبوعہ تہران ۱۳۳۲ ص ۵۵۔

خود سعدی اس کے نہ صرف ہم عصر تھے، بلکہ اس کے مستقر حکومت میں موجود تھے، ہمدان اصفہان رے سب پر اس کا قبضہ تھا،

اغلمش اتابکان آذربائیجان کے آخری بادشاہ اتابک ازبک (۶۰۷-۶۲۲) کا غلام تھا، رفتہ رفتہ اس کی ترقی ہوتی رہی یہاں تک کہ جب ازبک نے خلیفہ بغداد اور اسماعیلی حکمران کی مدد سے محمد بن منکلی[1] کو شکست دی، بعد بلاد جبال کے اکثر حصوں پر قابض ہو گیا، تو اتابک ازبک نے اغلمش کو نئے مقبوضات کا حکمران بنا دیا، محمد بن منکلی نے جنگ کی تاریخ جمادی الاول سنہ ۶۱۲ھ دی ہے، لیکن جہانگشا ج ۲ ص ۲۱۵-۲۱۶ میں سنہ ۶۱۱ھ ہجری بہرحال اغلمش کی فرمانروائی سنہ ۶۱۱-۶۱۳ھ سے شروع ہوئی سنہ ۶۱۴ھ میں وہ حجاج کے قافلے کے استقبال کے لئے نکلا تو چند فدائی جو حجاج کے مجمع میں بھیس بدل کر شامل ہو گئے، اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کا کام تمام کر دیا، (جہانگشا ج ۲ ص ۱۲۱، روضۃ الصفا ج ۴ ص ۱۳۹)

گلستان کی حکایت میں صاف طور پر ہے کہ سعدی نے اغلمش کے محل کے دروازے پر (جیسا کہ بعض روایت میں محل میں) سرہنگ زادے کو دیکھا تھا، پھر وہ اسی بادشاہ کا بہت پسندیدہ درباری ہوا، اس پر حاسدوں نے جب اس کے خلاف ناکام سازش کی تو بادشاہ نے اس سے سازش کا سبب پوچھا تھا، یہ تمام باتیں خود سعدی کو براہ راست معلوم ہوئی تھیں اور اسی بنا پر میرزا محمد قزوینی کا یہ درست قیاس ہے کہ شیخ ان دنوں اغلمش

---

[1] یہ عجیب بات ہے کہ سنہ ۵۹۱ھ سے ۶۱۳ھ تک بلاد جبال کی حکومت اتابکان آذربائیجان و خوارزم شاہ کے پانچ ترکوں کے سپرد رہی ہے، (۱) کوکجہ مملوک اتابک پہلوان محمد ایلدگز (سنہ ۵۹۱-۶۰۰ھ) (۲) میاجق مملوک خوارزم شاہ تکش (سنہ ۵۹۱-۵۹۵ھ)۔ (۳) اتغمش مملوک اتابک پہلوان (سنہ ۶۰۰-۶۰۸ھ) (۴) احمد منکلی مملوک اتابک ازبک بن جہاں پہلوان ایلدگز (سنہ ۶۰۸-۶۱۱ھ) (۵) اغلمش مملوک اتابک ازبک (۶۱۱ یا ۶۱۳ یا ۶۱۴ھ)

کے مستقر ہمدان میں موجود تھے، یہ واقعہ ۶۱۲ھ کے قبل کا ہے، اور اس وقت سعدی ایسے بالغ نظر ہو چکے تھے، کہ ایک نوجوان کو دیکھ کر اس کے مستقبل کے بارے میں حکم لگا سکتے تھے، اس لحاظ سے ان کی عمر ۳۰-۳۵ سال سے کم نہ ہونا چاہئے، اور اس طرح ان کی تاریخ پیدائش ۵۸۰ھ کے حدود میں قرار دی جا سکتی ہے۔

یہ مختصر گزارش ہے، ان داخلی امور کی جن سے سعدی کی تاریخ پیدائش پر استدلال کیا جا سکتا ہے، لیکن جیسا کہ شروع میں عرض ہو چکا ہے دو قسم کی شہادتیں ہیں، پہلی قسم کی رو سے ان کی پیدائش ساتویں صدی ہجری سے قبل قیاس نہیں کی جا سکتی، گلستان کی تالیف کے وقت ان کی عمر ۵۰ سال کے ارد گرد رہی ہوگی، لیکن دوسری قسم کی شہادت سے یہ واضح ہے کہ ان کی ولادت ۵۶۶ھ تا ۵۹۰ھ کے درمیان قرار دی جا سکتی ہے، لیکن اس قیاس کی صحت میں یہ امر مانع ہے کہ گلستان یا بوستان کی تالیف کے وقت شیخ نے اپنی پیرانہ سالی کا کہیں ذکر نہیں کیا، حالانکہ دوسرے قسم کی شہادتوں سے اس وقت ان کی عمر ۷۶، اور ۹۰ سال کے درمیان ہوتی ہے، اس سلسلے میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ۶۰۶ھ میں کاشغر کی موجودگی خود شیخ نے واضحاً لکھی ہے، اب ایسی واضح بات کو شیخ کی یادداشت کی کمزوری پر کیونکر محمول کیا جائے، اس میں شبہ نہیں کہ خود بعض باتیں شیخ کے یہاں ایسی ہیں کہ جن کو بادی النظر میں قبول کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے، خصوصاً شیخ کی سومنات میں موجودگی، مگر جو بات خود شیخ نے لکھ دی اس کو غلط قرار دینے کا حق کسی کو مشکل سے حاصل ہوگا، لیکن بعض محققین نے ان کو غلط بتایا ہے، مثلاً صفا لکھتے ہیں۔

علت دیگر حکایتی است کہ سعدی در بارہ سیری بجامع کاشغر و گفتار او با نو آموزی در آن جامع در سالی کہ محمد خوارزم شاہ تا ختا برائے مصلحتی صالح اختہ کرد

واگر در این حکایت از واقعیات سخن رفتہ باشد می بایست سعدی در آن تاریخ یعنی در حدود ۶۰۶ھ لا اقل بیست و اند سال داشتہ و در حدود ۵۸۵ھ ولادت یافتہ باشد اما در حقیقت این گونہ حکایات و حتی ہنر نمائی سعدی در شکستن بت سومنات و قتال انہا تردید است و با قرائن مختلف دیگری کہ از ماجرای احوال او بدست داریم وفق نمی دہد و قاعدۃً از جملہ حکایاتی بہ نظر می آید کہ او مہی باے تمثیل و برائے نکات اخلاقی ساختہ و پرداختہ باشد نہ از باب ذکر حکایتی حقیقی۔"[1]

اس قول کے سلسلے میں مجھے چند باتیں عرض کرنا ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اول ۶۰۶ھ میں سعدی کی عمر بیس سال سے کچھ زیادہ فرض کی گئی ہے، حالانکہ حکایت میں ہے کہ اس وقت تک سعدی کی شہرت عالمگیر ہو چکی تھی، ۳۰-۳۵ سال سے کم عمر میں یہ شہرت ممکن نہیں، دوم یہ کہ اگرچہ ان حکایات میں حقائق تاریخی کا ذکر مقصود نہ تھا، لیکن جب کسی واقعہ کا ضمنی ذکر آ گیا ہو تو اس کو یہ کہہ کر رد کر دینا کہ اس بہ بطور تمثیل کے ہے یا اس لئے محض اخلاقی نکتہ پیدا کرنا مقصود ہے، قابل قبول نہ ہوگا۔

میرے خیال میں سعدی کی تاریخ پیدائش کے سلسلے کی دو مختلف آرا کے درمیان مطابقت بغیر مزید شواہد کے ممکن نہیں، موجودہ شہادت کی روشنی میں یہ مسئلہ حل پذیر نہیں ہو سکتا اور اب تک اسی سلسلے کی ساری کوششوں میں کوئی کوشش قابل قبول نہیں قرار دی جا سکتی ہے،

---

[1] ۳۸ ص ۵۹۱ تا ۵۹۲

کتب خانۂ رامپور کا ایک معالجاتی قلمی تذکرہ

از
جناب حکیم محمد حسین خاں شفا کیٹلاگر رضا لائبریری، رام پور،

رام پور کے طبی ذخیرہ میں ایک کتاب "اقتباس العلاج عرف فضول فیض اللہ خانی" ہے اسکا کوئی دوسرا نسخہ میرے علم میں نہیں ہے، ناظم کتب خانۂ سرکاری جناب احمد علی خاں شوقؔ م ۱۹۳۲ء نے اس کے بارے میں تحریر کیا ہے۔

"فن طب میں اس جامعیت کی کتاب کم ہوگی، علاج معالجہ کے ساتھ واقعات مطب وحکایات بھی لکھے گئے ہیں۔"

اس کتاب کے مصنف حکیم محمد بایزید ہیں، جن کی عمر تالیف کے وقت تقریباً ستر سال کی تھی، انھوں نے اپنی زندگی کے طبی تجربات اس میں تحریر کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس مخطوطہ کے فہرست مضامین کے الگ ۵۸۶ اوراق ہیں، ہر صفحے پر اکیس ۲۱ سے تیس ۳۰ تک سطریں ہیں، تقطیع ۱۸ ½ × ۱۲ ½ انچ ہے، بد خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے، وجہ تصنیف حکیم بایزید نے یہ تحریر کی ہے کہ جب میں نے اپنے لڑکے میاں سعید احمد اور دیگر شاگردوں کی معالجات کی طرف رغبت دیکھی تو خیال ہوا کہ اس فن میں بھی ایک ایسی کتاب مرتب کروں جو نہ صرف میری حیات بلکہ میرے بعد بھی ان معالجات میں ان لوگوں کے کام آئے، اور بہت سی کتابوں سے بے نیاز کردے، حکیم بایزید اس کتاب کی تالیف سے ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۴ء میں فارغ ہوئے، اس میں آخری واقعہ جس کی بایزید نے سند بھی تحریر کی ہے ۱۲۷۳ھ اور ۱۸۵۶ء

کا ہے، وہ ورق ۴۳۶ پر لکھتے ہیں، میں ملک محمد عزیز خاں خٹک کے ایک عزیز کی شادی میں قصبہ بڑپورا میں گیا، جہاں دعوت کا کھانا کھا کر میرا بھائی اور کچھ لوگ، اسہال میں مبتلا ہو گئے، جن کا میں نے علاج کیا، بایزید نے اس علاج کی پوری تفصیل بھی درج کی ہے، زیر بحث نسخہ مصنف کے کسی شاگرد نے ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء میں اصل مسودہ سے نقل کیا ہے، یہ داخل کتب خانہ ہونے سے قبل مختلف حضرات کی ملکیت رہ چکا ہے، چنانچہ اس پر دست بخیر سے کچھ حواشی ونسخہ جات کا اندراج ہے، ورق ۲۷۹، ۱۷ دسمبر ۱۹۰۰ء کو یہ کتاب داخل کتب خانہ ہوئی صفحۂ اول پر تحویلدار مہدی علی خاں کا نوٹ ہے، شروع میں ۷ صفحات پر مشتمل فہرست مضامین ہے، جو اصل مخطوطہ میں نہیں تھی، یہ کارکنان کتب خانہ کی بنائی ہوئی ہے، اس قسم کے مخطوطات پر فہرست مضامین لگانے کا کام علامہ شبلی کی تحریک پر کتب خانہ سرکاری میں شروع کیا گیا تھا، حمد ونعت کے بعد ۱۲۵ کتابوں پر مشتمل فہرست مآخذ ہے، جس سے حکیم بایزید کی علمیت اور اس مخطوطے کی جامعیت کا پتہ چلتا ہے، فضول کے متن میں کچھ ایسی کتابوں کے نام بھی آتے ہیں جو فہرست مآخذ میں نہیں ہیں، ان میں کئی قدیم وجدید ایسی کتابوں کے حوالے ملتے ہیں جو اب نادر ونایاب ہیں، جدید کتابوں میں قوانین العلاج حکیم کبیر علی انصاری، دستور العمل حکیم اکمل خاں، معالجات حکیم ساجد خاں رام پوری اور کئی بیاضیں شامل ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکیم بایزید کے پاس خود طبی کتابوں کا وسیع ذخیرہ تھا۔

حکیم بایزید طب قدیم کے ساتھ طب جدید کے عصری رجحانات سے بھی واقف تھے انھوں نے فصول میں ایک باب ادویۂ جدیدہ مغربیہ افرنجیہ کے عنوان سے قائم کیا ہے، دیباچہ میں مصنف نے اپنی ۶ دیگر تصنیفات کا بھی تذکرہ کیا ہے، فصول سے پتہ چلتا ہے کہ حکیم بایزید کو مختلف طبی مسائل پر رسائل مرتب کرنے کا شوق تھا، جن کا انھوں نے مختلف امراض کے ذیل میں حوالہ دیا ہے،

چونکہ بایزید کے عہد میں علوم شرقیہ کا زوال اور ممالکِ اسلامیہ بحران میں مبتلا تھے، عربی زبان
علوم [illegible] اس طور سے فن سرجری سے بے رغبتی عام تھی، قوم پر بڑھاپا طاری تھا، ایسے
ماحول میں حکیم بایزید ایک مجدد طب کی حیثیت سے میدان میں آئے، اور انھوں نے فارسی
زبان میں خود نصابِ تعلیم طب مرتب کیا، اور برسوں اپنی درس گاہ میں پڑھایا، اس نصاب
کی جن کتابوں کا فصول میں حوالہ آیا ہے، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ جرائح النعمت، یہ کتاب حکیم بایزید نے بقولِ خود اپنے بھائی اور دیگر شاگردوں کو
طب جودی گلی یعنی سرجری کی تعلیم دینے کے واسطے ۱۱۶۵ھ میں مرتب کی تھی، جو اب انکی دیگر تصانیف کی طرح نایاب ہے۔

۲۔ فوائد نعمت نامی کتاب امراض متعدیہ وغیرہ سے متعلق ہے، اس کا ذکر دیباچہ اور
دوسرے باب میں کیا گیا ہے، سنہ تصنیف ۱۱۵۷/۱۷۴۴ ہے۔

۳۔ ایک رسالہ در معالجات حاملہ حل ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء کا مرتب ہے۔

۴۔ خزینۃ العلاج کے نام سے مقالات طب کو مرتب کیا، جس میں طب کے اختلافی
مسائل پر بحث کی ہے، سنہ تالیف ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۷ء ہے۔

۵۔ پانچ فصل نامی رسالہ رموزِ تشخیص و عملیات طب سے متعلق ہے ۱۲۰۲ھ میں مرتب کیا۔

۶۔ مرکبات قرابادین "نافع الامراض" بہت معرکہ کی کتاب ہے۔

علامہ نجم الغنی خان نے اس سے استفادہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں۔

اس قرابادین میں نسخہ ہائے مرکب جو جن لوگوں کیلئے تجویز کئے ہیں انکے نام ہر نسخے کے ساتھ
درج کر دیئے ہیں [illegible] کے امراض گوناگوں کا کچھ حال دلچسپ مرقوم ہے سنہ تالیف ۱۱۹۵ھ ہے"

حکیم بایزید کی تصانیف میں سے صرف فصول ہی میرے مطالعہ میں رہی ہے، تلاش کے باوجود کوئی اور کتاب اب تک
نہیں مل سکی فصول کے مسودہ سنہ تالیف کے بارے میں حکیم بایزید لکھتے ہیں۔

" چونکہ میں اس کتاب کی ترتیب جناب نواب فیض اللہ خاں کے عہد ۱۲۰۲ھ
میں [illegible] ہوں، اس وجہ سے ان کے اسم گرامی پر اس کا نام رکھا ہے۔"

اس مخطوطہ کا کاتب حکیم صاحب کا ایک عقیدت مند شاگرد ہے، وہ ترقیمہ میں تحریر کرتا ہے،

تمت الکتاب من مسودۃ المصنف قدس سرہ العزیز تصنیف مولانا ہادینا مولوی
محمد بایزید ساکن بلدہ مصطفیٰ آباد عرف رام پور۔

فصول کتب طبیہ میں کئی اعتبار سے ممتاز ہے، اس کے طبی اندراجات کی جامعیت تاریخی
واقعات کی صداقت اور علمی و ادبی حکایات کی ندرت اہلِ ذوق حضرات سے خراجِ تحسین وصول کرتی
رہے گی، اس مخطوطہ کی تدوین طب کی عام معالجاتی کتابوں کی طرح ترتیب اعضا پر ہے، جو امراض
راس سے شروع ہو کر قدم پر ختم ہوتی ہے، لیکن بلحاظ مواد وہ اس فن کی دیگر کتابوں سے ممتاز ہے،
بایزید نے جن اعضا کے امراض سے بحث کی ہے، پہلے ان اعضا کی مختصر تشریح اس کے بعد کچھ مفید
معلومات اور مبادیات علاج، امراض، علامات، عام معمولات اور خاص تجربات کا تذکرہ ہے،
پیچیدہ امراض کے سلسلے میں "فوائد" کا عنوان قائم کرکے اہم نکات اور خاص تشخیص رموز بیان
کئے ہیں کہیں کہیں دستور العلاج کا عنوان قائم کرکے اطبائے قدیم و جدید کا طریقہ علاج تحریر
کیا ہے، جس میں خاص طور پر دہلوی اسکول اور حکیم علوی خاں کا تفصیلی تذکرہ ہے، حکیم علوی خاں کے
بارے میں اس مخطوطہ میں کافی اہم معلومات ہیں، حکیم بایزید نے پہلے علوی خان سے طب پڑھی [illegible] بعد
علوی خاں کے کچھ شاگردوں سے بھی استفادہ کیا، وہ بحث بخار میں ورق ۲۴۴ پر تحریر کرتے ہیں،

"دربریلی مطب قاضی ثناء اللہ صاحب مرحوم کہ استاذ فقیر بود نذر [illegible] دیدم"

علوی خاں کے ہمعصر ایسے اطبا کے نام بھی فصول میں آتے ہیں، جن کا دیگر تذکروں میں
ذکر نہیں ہے، عموماً نسخے قلیل الاجزا مفردات پر مشتمل ہیں، مرکبات کے سلسلہ میں اپنی تصنیف
"قرابادین نافع الامراض" اور دیگر قرابادینوں کے حوالے دیئے ہیں۔

امراض وبائیہ میں کہیں کہیں سنہ، موسم اور مقام کا تعین بھی کر دیا ہے، آخر میں رموزِ تشخیص،

...... طبی مشکلات اور ان کے جوابات، علامات و احوال اموات، وصایا، تحقیق اسماء جمیع امراض
ادویات بطور اہل لغت فہرست ادویہ مفردہ مع خواص اور ورق ۵۱۰ ب سے حکیم ارزانی
کی عربی تصنیف حدود الامراض کا بایزید نے خود فارسی ترجمہ کر کے شامل کتاب کر دیا ہے،
فن معالجات سے متعلق حکیم بایزید نے دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی کوشش کی ہے، اور قدیم
متون کو سامنے رکھا ہے، اس وجہ سے بہت سی بحثیں تشنہ رہ گئی ہیں، کچھ عنوانات کا حق چند سطروں
میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

حکیم بایزید نے فصول میں اکثر امراض کی بحث میں ایک باب قصص و حکایات کا قائم کیا ہے،
جو غیر طبیب اہل علم کے واسطے بھی بہت کار آمد ہے، اس باب میں آخری عہد مغلیہ سے متعلق
سوانحی، سماجی، تاریخی اور علمی و ادبی معلومات ہیں چونکہ فنی طبی کتابوں کا عام طور پر تاریخی ماخذ
کے بطور مطالعہ نہیں کیا جاتا، اس وجہ سے اس کتاب کا یہ اہم حصہ اہل علم کی نظر سے پوشیدہ ہے،
اور پوری کتاب میں موتیوں کی طرح بکھرا ہوا ہے، مصنف نے اپنے حسب و نسب کے بارے میں
دیباچہ میں صراحت کی ہے۔

حکیم محمد بایزید خلف حقیقت آگاہ معرفت دستگاہ شاہ رحمت اللہ گنگوہی ابن
شاہ حافظ برخوردار از اولاد قطب عالم شاہ عبدالقدوس گنگوہی۔

بایزید کا خاندان کئی صدیوں تک تصوف و طب میں بہت ممتاز رہا، جن کا مختلف کتابوں
میں ذکر ملتا ہے، خاص طور سے بایزید کے نواسے ڈاکٹر شاہ محمد حسن صابری اٹھائیس[2] کتابوں
کے مصنف تھے، ان کی تصانیف میں تاریخ آئینہ تصوف[4] اور حقیقت گلزار صابری[5] بہت
مشہور ہیں، شاہ محمد حسن صاحب غیر ثقہ راوی اور عجوبہ پسند مصنف تھے، ڈاکٹر محمد اسلم لاہوری[6]
نے ان کی تصانیف کو داستان امیر حمزہ، الف لیلیٰ اور طلسم ہوش ربا، کی طرح محض افسانوی

قرار دیا ہے، پھر بھی ان کی تالیفات سے بایزید اور ان کے خاندان کے بارے میں کچھ مفید
معلومات کا اضافہ ہوتا ہے۔

محمد حسن صاحب لکھتے ہیں۔[5]

"حضرت آدم سے پہلے نظام عالم باطنی اجنہ کے سپرد تھا، اور اس کے احکام ایک
سنگ زبرجد پر کندہ تھے، حضرت آدم نے اجنہ سے یہ احکام لے کر اپنے لڑکے ستر توطو
کے حوالے کر دیئے، جو سلسلہ بسلسلہ حضرت امام ابو حنیفہ تک پہنچے اور انھوں نے اسکو
باقاعدہ ایک دستاویز کی شکل دے کر حضرت امام احمد عطا کے سپرد کئے، جس میں
خاندانی حالات اور نظام عالم باطنی سے متعلق احکام، حکمران عرب و عجم کا عزل و نصب اور
عروج و زوال بھی شامل ہے، اس دستاویز کا نام نقشہ حنفیہ قدسیہ ہے جس کو
ہمارے سلسلہ کا بزرگ بھرتا ہے"

شاہ محمد حسن صاحب کی اکثر تصانیف اس نقشہ[6] اور بزرگان کے مکاتیب سے ماخوذ ہیں،
محمد حسن صاحب لکھتے ہیں۔

"پنجاب کے علاقہ گجرات میں شاہ دولہ نامی بزرگ تھے، جن کی لڑکی قمر النساء بیگم
کا عقد حافظ برخوردار سے ہوا، جن سے شاہ رحمت اللہ پیدا ہوئے۔"

حافظ صاحب نقشۂ قدسیہ میں تحریر کرتے ہیں۔"

(میرے فرزند شاہ رحمت اللہ کی شادی بی بی اختر فاطمہ بنت حضرت سید احمد
آنولہ والے سے ہوئی، جن کے بطن سے ۱۱۳۲ھ/۱۷۱۹ء میں حکیم بایزید تولد ہوئے۔
صاحب اولاد ہیں انکی اولاد رام پور میں ہے۔)

محمد حسن صاحب اپنے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔

حافظ محمد عبداللہ بن حضرت شاہ نعمت اللہ کا نکاح ۱۲۰۰ھ میں خدیجہ بیگم بنت حکیم بایزید سے ہوا، جن سے فقیر محمد حسن مولف تاریخ آئینہ تصوف پیدا ہوا۔

حکیم بایزید ایک صوفی خاندان میں عملی طبیب تھے، ان کی پوری زندگی خدمتِ طب میں گذری، غالباً اسی وجہ سے کبھی تذکرۂ صوفیہ میں ان کا ذکر نہیں آیا اور نہ ان کے نواسے شاہ محمد حسن صابری نے دیگر ہزاروں اہل طریقت کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے، جب کہ فصول سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم بایزید بھی تصوف سے متاثر تھے، انھوں نے ورق ۳۶۴ ب پر امراض نسواں میں ایک تعویذ یہ لکھ کر تحریر کیا ہے کہ اس مرض میں ہمارے مشائخ یہ نقش دیا کرتے تھے۔

خاندان بایزید کی طبی خدمات کو سراہتے ہوئے مفتی عبدالقادر خاں م ۱۲۶۹ھ/۱۸۴۸ء نے روزنامچہ میں تحریر کیا ہے۔

”اس شہر رام پور میں فن طب میں ملا فقیر اخوند کا خاندان سب پر سبقت لے گیا ہے۔ ملا بایزید نے عمل جراحی کو کہ عرصہ سے اطبا اس سے عاجز تھے، اور ابلہ فریبی سے اس کام کو ذلیل بتاتے تھے، باوجود طبیب ہونے کے از سر نو اس فن کو حاصل کیا۔ اب ان کا بھائی نعمت اللہ اس نوع میں اس فن میں یکتائے زمانہ مشہور ہے، اب بھی اس گھرانے میں یہ بیمار داری جاری ہے۔ ملا مرحوم کے جانشین اس کے لڑکے ملا احمد سعید تھے۔“

علامہ نجم الغنی خاں نے اخبار الصنادید میں نواب فیض اللہ خاں کے عہد کے مشائخ[۱۰] وعلما کے ذیل میں حکیم بایزید کا بھی ذکر کیا ہے، جس کو حکیم کوثر چاند پوری نے اطبائے عہد مغلیہ میں کچھ تسامحات کے اضافے کے ساتھ نقل کر دیا ہے۔

چونکہ حکیم بایزید نے اپنے بھائی ملا فقیر اخوند ولادت ۱۱۴۳ھ، کو انکے زہد و تقویٰ کی

وجہ سے ہر جگہ تعظیمی کلمات سرکار صاحب سرتاج وغیرہ الفاظ سے یاد کیا ہے، جب کہ ملا صاحب بایزید سے ۱۱ سال چھوٹے تھے، اس وجہ سے نجم الغنی خاں نے حکیم بایزید کو چھوٹا بھائی تصور کیا ہے۔

کوثر صاحب تحریر کرتے ہیں۔

حکیم بایزید حکیم کبیر علی انصاری سنبھلی[۱۱] کا بیٹا تھا۔

کوثر صاحب کا یہ خیال بھی غلط ہے، حکیم کبیر علی انصاری بایزید کے استاد تھے، ان سے نسبی تعلق کچھ نہیں تھا، تذکرۂ کاملان رام پور اور حقیقت گلزار صابری وغیرہ میں خاندان بایزید کا جو شجرہ ہے، وہ حکیم کبیر علی انصاری کے خاندان سے نہیں ملتا، حکیم بایزید کو غالباً روزنامچہ نویسی کا شوق تھا، یا ان کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا، جو انھوں نے آخری عمر میں ابتدائے شباب کے واقعات تفصیل سے تحریر کر دیئے ہیں، تاریخی اعتبار سے فصول میں ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء سے ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء تک کے واقعات کہیں کہیں تعین سنہ کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں، یہ منتشر واقعات بھی تاریخ طب کا بیش قیمت ذخیرہ ہیں۔

واقعات طاعون میں بایزید تحریر کرتے ہیں، جب میں نواب فیض اللہ خاں کے ساتھ سرہند میں مقیم تھا، اس دوران وہاں طاعون پھیلا جس میں سیکڑوں افراد مرگئے، میں نے کچھ مریضوں کا جدوار، سرکہ، پیاز وغیرہ سے علاج کیا، وہ ٹھیک ہوگئے، چنانچہ ورق ۲۲۰ پر کچھ مجرباتِ طاعون تحریر کئے ہیں، بحثِ سیمات میں مزید لکھتے ہیں۔

”سرہند میں میں نے ایک فقیر کو دیکھا، جو سیماب خام کھاتا تھا، اس نے پارا کھانے کا مظاہرہ میرے اور نواب فیض اللہ خاں کے سامنے کیا“۔

ایک جگہ احمد شاہ درانی کی غیر معمولی توانائی کا تذکرہ ہے، ان واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ حکیم بایزید ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء سے ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۱ء تک پنجاب اور افغانستان میں نواب فیض اللہ خاں کے

ساتھ رہے، تاریخی مقامات کے ذیل میں بایزید نے ملتان، سرہند، افغانستان، الموڑہ، سنبھل امروہہ اور پیلی بھیت وغیرہ کا ذکر کثرت سے کیا ہے، جس سے ان مقامات پر بایزید کی آمد ورفت ثابت ہوتی ہے، بایزید روہیل کھنڈ کی پہلی جنگ آزادی میں حافظ رحمت خاں علیہ کے ساتھ تھے جس میں اپریل ۱۷۷۴ء کو حافظ رحمت خاں شہید ہوئے، اس کے بعد اکتوبر ۱۷۷۴ء میں نواب فیض اللہ خاں نے رام پور کو پایہ تحت قرار دیا، اور دیگر مشاہیر کے ساتھ حکیم بایزید بھی رام پور میں آگئے، اور یہیں انتقال کیا، وہ مرض خناق میں استعمال چائے کا ایک دلچسپ واقعہ تحریر کرتے ہیں، ان کا بیان ہے کہ ا۔

ابتدائے تشکیل رام پور میں نواب فیض اللہ خان اطبائے دربار سے چائے کے مزاج اور نقصان کی بابت استفسار کیا، جس کے بارے میں شدید اختلاف رائے ہوا، اور حکیم مرزا بو علی اپنی اس رائے پر اڑ گیے، کہ چائے درجہ سوم میں گرم و خشک ہے، نواب صاحب کو اس کا ہرگز استعمال نہ کرنا چاہیے، یہ زہر کا کام کرے گی، جب کہ نواب صاحب انگریزوں میں متعدد بار چائے نوشی کر چکے تھے، نواب صاحب نے انچارج دواخانہ شاہی حکیم عطاء اللہ غمی کاشمیری کو حکم دیا کہ وہ اپنی والدہ سے چائے بنوا کر لائیں میرزا ابو علی کو اپنی بات خراب ہونے کا احساس ہوا اور انھوں نے چائے میں خربق سیاہ (کٹکی) شامل کرا دی، جس کے پینے سے نواب صاحب کو خناق ہو گیا، دوسرے روز حالت بہت بگڑ گئی، اطبائے دربار کو جمع کیا گیا جن کے نام حکیم بایزید نے یہ تحریر کیے ہیں، حکیم کبیر علی انصاری سنبھلی، حکیم احمد علی انصاری، حکیم محسن خان شاگرد حکیم شریف خاں، حکیم دیوکی نندن، حکیم عزالدین میرٹھی، حکیم حافظ محمد یار خان شاہ جہاں پوری، حکیم محمد زماں خاں، حکیم واجد علی خاں، حکیم صغیر علی، حکیم حافظ محمد یار خان

حکیم عطاء اللہ غمی

حکیم بایزید لکھتے ہیں۔

اطبا نے چائے میں زہر کی آمیزش کا شبہ ظاہر کیا، نواب محمد علی خاں کی تفتیش سے لالہ دیپ چند عطار نے یہ بتایا کہ والدہ حکیم غمی نے خربق سیاہ منگائی تھی، جو حکیم مرزا ابو علی کے اشارے پر چائے میں ڈال دی گئی، اس انکشاف کے بعد میرزا ابو علی تو فرار ہو گئے، فصد کھول کر اور تبرید سے فیض اللہ خاں کا علاج کیا گیا، نواب صاحب نے ٹھیک ہو کر سارے معالجین کو انعامات سے نوازا۔

اس کی تفصیل فصول میں بایزید نے تحریر فرمائی ہے۔

اس ایک واقعہ کے ذیل میں بایزید نے دربار رام پور سے وابستہ ۴۱ اطبا کا ذکر کیا ہے، فصول سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں ہر چھوٹا اور بڑا رئیس کسی نہ کسی طبیب کا کفیل تھا، جس کی وجہ سے عوام کو طبی سہولت مفت حاصل تھی، بایزید نے کئی دولت مند خواتین کا ذکر بھی کیا ہے جس میں بیگم نواب سعد اللہ خاں بھی شامل ہیں، جو طبیبوں کو تنخواہ دیا کرتی تھیں، بایزید نے کامیاب معالجہ پر ملنے والے انعامات اور اس عہد کے رئیسوں کی علمی دوستی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، وہ پیچش کی بحث میں لکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ نواب محمد علی خاں کو پیچش ہو گئی، میں نے اور حکیم احمد علی نے علاج کیا، جب وہ صحت یاب ہو گئے تو نواب فیض اللہ خاں نے دونوں کو نقد انعام و جاگیر سے نوازا جس میں ۵۰۰ روپے اور ۵۰۰ بیگھہ پختہ اراضی بشارت نگر میں حکیم بایزید کے حصہ میں آئی"

بایزید اپنے ہم عمر اطبا میں حکیم احمد علی انصاری سے بہت متاثر ہیں، انھوں نے اپنے اور اپنے خاندان کے معالج کی حیثیت سے ان کا ذکر کیا ہے، فصول سے اطبا کے آپس میں خوش گوار روابط

اور مشترکہ علاج و معالجہ کے بہت سے واقعات کا پتہ چلتا ہے، اس میں کئی غیر مسلم معالجین کا بھی ذکر ہے، وہ لکھتے ہیں کہ نواب مصطفیٰ خاں ولد حافظ رحمت خان کی بیوی حکیم بھاگیرت مصرا اور حکیم منوہر مصرا کے زیر علاج رہتی تھیں، ایک مرتبہ ان کے علاج سے طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی تو نواب فیض اللہ خان نے مجھے ان کا علاج کرنے کا حکم دیا، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ بایزید کو امراض دماغیہ اور سرجری میں خصوصی مہارت تھی، انھوں نے ان امراض میں اپنے جوہر زیادہ دکھائے ہیں، اور غور سے تفصیل سے بحث کی ہے

فصول میں بایزید نے اپنے چند شاگردوں کا بھی ذکر کیا ہے، جن میں حکیم شاہ نواز خاں بھی شامل ہیں، یہ اپنی والدہ کے علاج کے سلسلہ میں بایزید کے پاس گئے، جوان زیرک اور ذہین تھے، بایزید نے جوہر قابل کو پرکھ لیا، اور ان کو خدمتِ خلق اور تعلیم طب کی طرف متوجہ کیا، اور تھوڑے ہی عرصہ میں شاہ نواز خان کو ایک ماہر طبیب بنا دیا، یہ ایک دولت مند گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد ملا نظام والدین ولایتی یوسف زئی سالار خیل بہت با اثر رئیس تھے۔ کا ملان رام پور وغیرہ میں مذکور ہے کہ جب شاہ نواز خان نے مطب شروع کیا تو والد اور استاد نے ان کو یہ نصیحت کی تھی کہ اللہ کا دیا معاش تمھارے پاس کافی ہے، طب خدمتِ خلق کا ذریعہ ہے، دنیاوی فوائد حاصل کرنے کا وسیلہ نہیں، اگر اتفاقِ زمانہ سے دنیاوی مصائب آجائیں تو وقار فن کا خیال رکھنا، علماء سادات اور اہل خدمت سے کوئی رقم مت لینا، حکیم شاہ نواز خاں کا ساری عمر استاد کی اس نصیحت پر عمل رہا۔ اور ان کی نسل سے قدرت نے ہر دور میں کامیاب معالجین پیدا کیے، جن میں حکیم عبدالرحمٰن خاں، ان کے بھائی حکیم عبدالرحیم خاں، اور حکیم عبدالرحیم خاں کے لڑکے ڈاکٹر عبدالحکیم خاں، اور ان کے لڑکے ڈاکٹر خالد خاں ہوئے۔ ڈاکٹر عبدالحفیظ اور ڈاکٹر عبدالرشید کا بھی اسی خاندان سے تعلق ہے۔

رام پور کے اکثر اطبا کا سلسلہ حکیم بایزید تک پہونچتا ہے، جس میں حکیم محمد اعظم خاں اور حکیم نجم الغنی خان بھی شامل ہیں، بایزید خدمتِ خلق تزکیہ نفس اور اخلاقی اقدار کی پابندی کو طبیب کیلئے ضروری قرار دیتے ہیں، انھوں نے (وصایائے طبیب) میں ان اصولوں پر زور دیا ہے، تاریخی و تہذیبی واقعات کے ساتھ فصول بہت سے مشاہیر کا بھی تذکرہ ہے، جن میں ملا فقیر اخوند، ملا احمد سید اعظم شاہ گنگوہی، مولوی مغل، ملا عبدالرحمٰن قوہستانی، قاری نسیم، حافظ رحمت خاں، حکیم غلام رسول حکمت، حکیم میرزا عاشور بیگ، حکیم بھولانا تھ، حکیم محمد افضل خاں، حکیم دوست محمد خان، حکیم عبدالرسول، حکیم محسن خاں کاشمیری، حکیم محمد ساجد خان رام پوری، حکیم شاہ باز خان، حکیم محمد امان خاں، حکیم اللہ داد خاں وغیرہ شامل ہیں،

بہت سے رئیسوں کے آپس کے تعلقات اور ان کے مصاحبین کی تفصیل بھی فصول سے معلوم ہوتی ہے، بایزید نے جہاں کامیاب معالجات کا تذکرہ کیا ہے، وہاں بعض امراض میں اطبا کی ناکامیوں کا بھی ذکر کیا ہے، وہ بحثِ سوزاک میں لکھتے ہیں۔

جناب قاضی سنہ صاحب کو ایک موذی مرض ہو گیا تھا، یہ نواب فیض اللہ خاں کے مصاحب خاص تھے، ان کے علاج کے سلسلہ میں نواب صاحب نے خود دلچسپی لی اور حکیم غلام رسول حکمت سے علاج کرایا لیکن قاضی صاحب اس مرض سے جانبر نہ ہو سکے، اور ان کا انتقال ہو گیا۔

قاضی سنہ صاحب کا تذکرہ سوانح حافظ جمال اللہ صاحب "مجمع الکرامات"[12] میں امام الدین خاں اور فرزند غوث الاعظم[13] میں میکش اکبرآبادی صاحب نے کیا ہے، قاضی صاحب کو حافظ شاہ جمال اللہ اور شاہ عبداللہ بغدادی صاحب کے درمیان ایک جھگڑے کا بانی قرار دیا ہے۔ جس میں دونوں بزرگوں کے خوانش میں خون ریز تصادم ہوا تھا۔

فصول سے بعض مشاہیر کے ایسے واقعات بھی معلوم ہوتے ہیں، جن کا کسی اور نے تذکرہ نہیں کیا ہے، بایزید نے بحثِ دردِ سر اور افیون میں شاہ عبداللہ صاحب بغدادی کے بارے میں لکھا ہے، کہ حضرت شاہ عبداللہ بغدادی نبیرۂ حضرت غوث الاعظم عرف بنے میاں صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ میں نے شہر بھوپال میں ایک جوان صحت مند خوش خوراک فقیر کو دیکھا، جو بہت بڑا افیون کا گولہ دونوں وقت کھاتا تھا، اور سانپ سے کٹواتا تھا، لیکن اس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا

تاریخ ہند میں اورنگ زیب کے بعد کا عہد کافی پیچیدہ ہے، اس دور میں مختلف گروہوں نے خاندانِ مغلیہ کی جانشینی کی جدوجہد کی، جن میں روہیلے بھی شامل ہیں، بدقسمتی سے روہیلوں کو مغل سید، مرہٹوں اور انگریزوں نے ہدفِ ملامت بنایا ہے، بایزید نے روہیلہ عوام اور خواص کی صحیح نباضی کی ہے، وہ روہیلکھنڈ کی دوسری جنگِ آزادی کے سپہ سالار مصطفےٰ خاں عرف ببجو خاں شہید (۲۴ اکتوبر ۱۷۹۴ء) کے خاندانی معالج تھے، انھوں نے ببجو خاں کے خاندان کے کئی افراد کا ذکر کیا، بحثِ حمیات میں لکھتے ہیں

ایک مرتبہ ببجو خاں کو بخار آگیا، جو حکیم دوست محمد خاں کے علاج کے باوجود کافی عرصہ چلتا رہا، ایک روز ببجو خاں کے مصاحبین جمع تھے، جن میں محمد خاں جمعدار، بخشی مرتضیٰ خاں قلندر خاں جمعدار، ماندھیا خاں جمعدار، بشارت اللہ امروہی، میر محمد قائم، میاں تفضل حسن خاں اور حکیم سید ضیاء الدین عبرت بھی شامل تھے، حکیم عبرت نے کہا کیا شہر میں اور کوئی طبیب نہیں ہے، جو خاں صاحب کا علاج کرسکے، اس پر حکیم دوست محمد خاں نے فرمایا خاں صاحب کے ٹھیک نہ ہونے کا سبب علاج کی خرابی نہیں خان صاحب کی بدپرہیزی اور علاج میں تساہلی ہے۔

بایزید کا خیال ہے کہ روہیلوں کو دوا تو پلائی جاسکتی ہے لیکن پابندِ پرہیز کرانا آسان نہیں

فصول کے ادبی لطائف میں نواب محمد یار خاں امیر اور حکیم کبیر علی کبیر انصاری سنبھلی کا واقعہ بہت دلچسپ ہے، امیر اپنے عہد کے بہت بڑے رئیس تھے، اور ان کی دولت کا بڑا حصہ اہلِ علم و فنکاروں کی خدمت میں صرف ہوتا تھا، سودا، مصحفی، قائم چاندپوری بھی ان کی دولت سے مستفید ہوتے رہتے تھے، بایزید امراضِ چشم میں لکھتے ہیں۔

ایک مرتبہ امیر کی آنکھ میں سال کی لکڑی کا ایک ریزہ پڑگیا، چونکہ حکیم کبیر مستقل تنخواہ دار ملازم تھے، انھوں نے علاج شروع کیا، پہلے محمد حیات جراح سے ریزہ نکلوایا پھر زخم و ورم اور دیگر تکلیفوں کی دوا دی، جب امیر ٹھیک ہوگئے تو انھوں نے اس خوشی میں جشنِ صحت منعقد کیا، اور اپنے اکثر مصاحبین کو جن میں سید حسن شاہ میر ضیاء الدین عبرت، میر محمد قاسم شاہ، میاں عزالدین وغیرہ کو خلعت اور نقد و جنس سے نوازا۔

لیکن حکیم کبیر کو بالکل نظرانداز کردیا، ممکن ہے اس کی وجہ ان کی مستقل ملازمت ہو۔ حکیم صاحب نے اس بات کو محسوس کیا، اور ذیل کی رباعی لکھ کر نوازی نامی خیاط کے ہاتھ نواب محمد یار خاں امیر کو بھیج دی۔

جنابِ عالی کرا آج غسلِ صحت کا — ہر اک ندیم کے تئیں عطر اور پان ملے
بجائے خلعت بست پارچہ و اسپ عراق — حکیم جی کو بھی کہتے ہیں تین تھان ملے

فصول کا یہ مخطوطہ تاریخِ طب آخری عہدِ مغلیہ کی تہذیب اور حالاتِ روہیلکھنڈ سے دلچسپی لینے والوں کے لیے بہت کارآمد ہے، اس قسم کے فنی مخطوطات کی اشاعت ہر طبقہ کے لئے مفید ہے، رام پور کے طبی ذخیرے میں اس قسم کے جواہر پارے اور بہت سی بیاضیں محفوظ ہیں۔

حوالے

فصول فیض اللہ خانی فہرست فارسی مخطوطات فن طب نمبر ۱۳۸۶

تذکرہ کاملان رامپور، از حافظ احمد علی شوق مطبوعہ ۱۹۲۹ء ص ۷۶

فہرست زرد فارسی قلمی صفحہ ۱۵۴ مرتبہ مولوی عبید اللہ بسمل و مہدی علی خاں طب نمبر ۲۲ سابق

تاریخ آئینہ تصوف مولفہ شاہ محمد حسن صابری مطبوعہ ۱۳۱۱ھ صفحہ ۳۹۴ -

حقیقت گلزار صابری رر مطبوعہ ۱۹۳۸ء صفحہ ۴۹/۳

پروفیسر محمد اسلم لاہوری کا تبصرہ شریف التواریخ نوشاہی پر برہان دہلی جنوری ۱۹۸۳ء

شاہ دولہ کا تذکرہ رسالہ صاحبیہ مولفہ شہزادی جہاں آرا، مرتبہ محمد اسلم لاہوری صفحہ ۶۱

وقائع عبد القادر خانی مخطوطہ ________ مطبوعہ علم و عمل ۱۹۶۰ء مرتبہ ایوب قادری،

اخبار الصنادید ج اول مطبوعہ ۱۹۱۸ء مولفہ نجم الغنی خاں صفحہ ۲۰۱

اطبائے عہد مغلیہ از حکیم سید کوثر چاند پوری، مطبوعہ ۱۹۵۵ء صفحہ ۵۸

حیات حافظ رحمت خاں مولفہ الطاف حسین بریلوی مطبوعہ ۱۹۳۳ء صفحہ ۲۸۵

مجمع الکرامات و نیز امام الدین خان، صفحہ ۵۴

فرزند غوث الاعظم از میکش اکبرآبادی، مطبوعہ ۱۹۶۶ء صفحہ ۱۵۷

منظومات جنگ درجوڑا، مخطوطات فارسی

الواحُ الصّنادید

از

جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب استاذ شعبۂ تاریخ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

(۳)

بھاٹی دروازے سے باہر، سرکلر روڈ اور گنج بخش روڈ کے اتصال پر لاہور کا مرکزی امام باڑہ واقع ہے، جو کربلائے گامے شاہ کے نام سے موسوم ہے۔ اس امام باڑے کے احاطے میں اردو زبان کے عظیم انشا پرداز، سخندان فارس، آب حیات اور دربار اکبری کے مصنف مولوی محمد حسین آزاد کی قبر ہے۔ ان کے فرزند آغا محمد ابراہیم نے قبر پر ایک قبہ تعمیر کروا دیا تھا، قبے کی پیشانی پر "مقبرۂ آزاد" اور اثر نیات آغا محمد ابراہیم بن شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد رحمۃ اللہ علیہم از رجب ۱۳۲۸ھ مرقوم ہے، آزاد کی قبر کے سرہانے لوح نصب نہیں کی گئی البتہ تعویذ پر یہ عبارت درج ہے:

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

علی ولی اللہ وصی رسول اللہ

مرقد شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کہ بتاریخ ہژدہم ذی الحج ۱۲۴۵ھ تولد شدہ و شب نہم محرم الحرام ۱۳۲۸ھ ازین دار فانی رحلت فرمود، قطعۂ تاریخ وفات و بنائے مزار جناب شمس العلماء مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد دہلوی نور اللہ مرقدہٗ

جناب قبلہ محمد حسین آزاد آہ — کہ بود عالم استاد نثر و نظم نگار

بہ بے نظیر تصانیف نامی دوراں — بعلم و فضل چو پدرش شہیر شہر و دیار

بشعر شعرے شعارش فدا ہمہ شعراء — بنثر نثرہ نثارش نثار ہر نثار

یگانہ موجد نو طرز اردو لٹریچر — کہ گشت خاتمہ آں زر حلتش یکبار

وفات در شب تاسوعۂ محرم یافت — شد از غروب چناں ماہ دہر تیرہ و تار

رشید پورش آغا محمد ابراہیم — بساخت در لاہور ایں مزار پُر انوار

پئے وفات و بنائے مزار اقدس او — بخواستم تاریخ اے متین دل افگار

بغیر تعمیہ و تخرجہ سروش گفت

وفات استاد آزاد و ہم بنائے مزار — سنہ ۱۳۲۸ھ

از ہیچداں اندوہگیں خلیفہ سید محمد محسن متینؔ،

حضرت میاں میر لاہوریؒ کے احاطۂ مزار کے اندر باؤنڈری وال کے ساتھ مشہور ادیب اور مورخ شیخ محمد اکرام کی قبر ہے۔ ان کی تصانیف میں سے آب کوثر، رود کوثر، موج کوثر، ارمغانِ غالب اور نوائے پاک خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے:-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

شیخ محمد اکرام

تاریخ پیدائش — ۱۰ ستمبر سنہ ۱۹۰۸ء

تاریخ وفات — ۱۷ جنوری سنہ ۱۹۷۳ء

انا للہ و انا الیہ راجعون

شیخ محمد اکرام مرحوم کی قبر سے اندازاً پندرہ میٹر جانب جنوب مشرق لاہور کے ایک

نامور شاعر اکبر لاہوری محوِ خواب ابدی ہیں، اُن کی لوحِ مزار پر جو عبارت کندہ ہے وہ اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں لکھی گئی ہے، وہ یہ ہے:-

یا اللہ

یا محمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اکبر یار ملنگ علی دا

پنجاب دے مَنّے پرمنّے[51] شاعر، ادیب، مقرر، وکیل تے[52] درویش

بابائے لاہور چوہدری محمد اکبر خانؒ جی (اکبر لاہوری) دی

آخری آرامگاہ

بزمِ احباب کو چمکایا ہے میں نے برسوں

کم ہوئی تھوڑی سی دنیا کی ضیا میرے بعد

اپنی روداد کے استاد ہیں میر و غالب

میں نے اکبر وہ کہا جو کہ ہوا میرے بعد

(اکبر لاہوری)

تریخ[53] پیدائش : ۵ جولائی سنہ ۱۹۱۰ء

تریخ وفات : ۲۴ ستمبر سنہ ۱۹۷۲ء

بروز جمعۃ الوداع

بمطابق ۲۸ رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۲ھ

---

۵۱ مَنّے پرمنّے بمعنی مسلّمہ   ۵۲ تے ۔ بمعنی کے،

۵۳ پنجابی زبان میں تاریخ کی املا تریخ ہے،

نذرانہ ویس پنجاب محاذ - سابنجھاں پبلی کیشنز

۹-۱اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور

اکبر لاہوری اردو اور پنجابی کے بڑے بلند پایہ شاعر تھے، راقم الحروف نے انھیں کئی با مشاعروں میں سُنا ہے، انھوں نے اکبر کہانیاں" کے عنوان سے ایک کتاب اپنی یادگار چھوڑی ہے،

اسی احاطۂ قبور کے جنوب مشرقی گوشے میں ایک پختہ مقبرہ کے اندر خواجہ حسن نظامی دہلوی کی صاحبزادی حور بانو ابدی نیند سو رہی ہیں، ان کے مقبرہ کی دیواروں پر بڑی لمبی چوڑی عبارتیں درج ہیں، جو خواجہ حسن نظامی کے قلم کا شاہکار ہیں، مقبرہ کی غربی دیوار پر یہ عبارات کندہ ہیں،

قبر سیدہ حور بانو بنت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی

۳۵ ویں پشت میں اولادِ علی — اٹھارہویں پشت میں جانشین
۱۸ ویں پشت میں بابا فرید گنج شکرؒ — محبوبِ الٰہی خواجہ سید محمد امام
کی نواسی، — کی پوتی

عمر ۴۶ سال ولادت دہلی وفات لاہور

مرضِ مصائب انقلاب، پیکر صبر بے اولاد خوش تقریر خوش تحریر

سلوک درویشی میں کاملہ، حضرت میاں میر کی مہمان

تربتِ خاموش

ہو منزلِ لیلیٰ اس جگہ وہ عفتِ خاموش — آغوش میں ہے جس کو لئے رحمتِ خاموش
تربت یہ زیارت گہِ حورانِ جناں ہے — آسودۂ خواب اس میں ہے اک عصمتِ خاموش

آتے ہیں ملائک جہاں نظروں کو جھکا کر — یہ خواب گہِ حور ہے اک جنتِ خاموش
نام اپنے اب و جد کا کیا جس نے درخشاں — آسودہ ہے اس قبر میں وہ طلعتِ خاموش
مدفون یہاں آلِ نبی کا ہے خزانہ — یہ پیکرِ خاموشی کی ہے تربتِ خاموش"

(از نازش رضوی مرحوم) — ۱۹۴۹ء

مقبرہ کی غربی دیوار پر یہ عبارت مرقوم ہے :-

"اس خاکی چھپرکھٹ میں خواجہ حسن نظامی دہلوی کی بیٹی حور بانو ابدی نیند سو رہی ہے، پانچ سال کی عمر تھی کہ اس کی ماں حبیب بانو نے وفات پائی، باپ نے جوانی تک پالا، ۱۹۴۷ء کے انقلابِ دہلی کے مصائب برداشت کر کے باپ کے ساتھ حیدرآباد میں ایک سال رہی، پھر شوہر کے ساتھ پنجاب بس گئی ۱۱ ذی قعدہ ۱۳۶۸ھ ۰ ستمبر ۱۹۴۹ء کو لاہور کے ہسپتال میں وفات پائی،

چھوٹے بھائی خواجہ حسین نظامی اور مرید پاک دل محمد حسین نظامی اور حکیم منزل شاہ نظامی اور سید مبارک علی نظامی نے تیمارداری کی، باپ دہلی میں نظر بند تھے، آخر وقت بیٹی کو نہ دیکھ سکے، پیر سید علی شاہ صاحب سجادہ نشین درگاہ حضرت میاں میر صاحب نے اس بیکس پردیسی کو قیامت تک سونے کے لئے گھر دیا، باپ نے "بیٹی کی کہانی باپ کی زبانی" کتاب شائع کی،

پاک پٹن شریف میں اس کے دادا حضرت مولانا بدر الدین اسحٰق اور نانا حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ اور دہلی میں سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ، اور ان کے فرزند معنوی اور جانشین حضرت مولانا خواجہ سید محمد امام اور اس کی ماں حبیب بانو (اور اب حور بانو مرحومہ کو بچپن سے پالنے والے، اور ماں باپ استاد اور مرشد کے فرائض انجام دینے والے حضرت

خواجہ حسن نظامی (حسن ثانی نظامی) کی ارواح اس کی یونس ہیں لکھنے والا حسن نظامی

۴۷ برس کا بڈھا بیٹی کے ہجر میں بیقرار ہے، مگر اپنی صابر بیٹی کی بہادری پر فخر کرنے والا ہے، ۱۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو دہلی درگاہ کی بستی میں جب فوج کے سپاہی حور بانو کے گھر میں ہتھیاروں کی تلاشی لینے آئے تو اس نے مردانہ ہمت سے اپنے ہاتھ کی تسبیح دکھا کر کہا کہ ہمارا ہتھیار خدا کی یاد اور یہ تسبیح ہے، باہر جاؤ، میں تمھاری بندوقوں سے نہیں ڈرتی، دکھیا بیٹی تو ساری عمر شوہر کے گھر میں آرام سے رہی، اور تو نے صبر کر کے مجھے صبر سکھایا، اب حشر تک آرام سے سوتی رہ، زندگی اک خواب ہے، اور موت بڑی بیداری ہے"

حسن نظامی دہلوی بقلم پاک دل محمد حسین محرم شاہ نظامی عید میلاد ۱۳۶۹ھ مقام حجرہ خواجہ نظام الدین اولیا، محبوب الٰہی دہلی،

حضرت میاں میر رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے جنوبی دروازے سے باہر نکلیں تو دائیں ہاتھ ایک چبوترے پر گنتی کی چند قبریں ہیں، ان قبروں میں سب سے نمایاں قبر مشہور مزاح نگار اور ناولسٹ شوکت تھانوی کی ہے،

شوکت مرحوم بڑے زود نویس تھے، ان کی تصانیف میں سے منشی جی، مولانا، قاضی جی، بڑے بھیا، بقراط، قاعدہ بے قاعدہ، بکواس وغیرہ وغیرہ جی ہاں بیٹے ہیں خبطی، سونیا یا مجھے خرید لو، داماد، سودیشی ریل، کبھی کبھی، کچھ یادیں کچھ باتیں، مکرر ارشاد، شیش محل، راجہ صاحب، پگلی، خانم خاں، نقشا، اثر، الٹ پھیر، کارٹون، ہمہ خاتون، شوکتیات، نیلوفر، مسٹرہ ۵، برق تبسم، بیٹے، چار سو بیس، لاہوریات... ... ... غالب کے فدائے بھسرال، دل پھینک، دنیائے تبسم، بیگم صاحبہ اور بار خاطر خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

شوکت تھانوی کی لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ،

شہنشاہ ظرافت ادیب و صحافی

محمد عمر شوکت تھانوی تمغۂ امتیاز

بعمر ۵۹ سال ۴ مئی ۱۹۶۳ء مطابق ۹ ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ

کو لاہور میں رحلت فرما گئے،

قطعۂ تاریخ وفات

از ظریف جبل پوری

بذلہ سنج و مردِ خوش اطوار شوکت تھانوی ۔۔۔ اب کہاں وہ ابرِ گوہر بار شوکت تھانوی

عیسوی ہجری ہوا اک مصرع تاریخ وفات ۔۔۔ "شہنشاہِ سخن نثار شوکت تھانوی"

۱۹۶۳ء + ۱۳۸۲ھ = ۳۳۴۵ ۳۳۴۵

شوکت تھانوی کی آخری آرامگاہ سے جانبِ مشرق اندازاً چالیس میٹر کے فاصلہ پر لاہور کے نامور حکیم محمد موسیٰ امرتسری سکریٹری مجلس رضا کے والد بزرگوار حکیم فقیر محمد چشتی کی قبر ہے، مرحوم بڑے اونچے پایہ کے طبیب تھے، ان کے فرزند حکیم محمد موسیٰ نے ان کی بیاض شائع کر دی ہے، جس میں بڑے مجرب اور تیر بہدف نسخے درج ہیں، حکیم صاحب کی لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ

فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

مزار پُر انوار

فخر الاطبأ عالی جناب حکیم فقیر محمد چشتی نظامی امرتسری نوّر اللہ مرقدہ ثم لاہوری
بتاریخ ۲۲ اپریل ۱۹۵۲ء مطابق ۲۷ رجب المرجب ۱۳۷۱ھ
درشبِ معراج جان بجان آفریں تسلیم نمود

قطعۂ تاریخ

رفت ازجہاں فقیر محمد کہ بیگماں — درہر دو علم ماہر و وہاج آمدہ
گرگینہ پوش ماند مثال عمر بعمر — در دستش ارچہ سندس و دیباج آمدہ
شیخ المعالجات کہ بُد عارفِ الٰہ — ہرگام او بجادۂ منہاج آمدہ

تاریخ رحلتش بدل ناقی حزیں
حضرت نجیب درشبِ معراج آمدہ
۱۳۷۱ھ

یہ قطعۂ تاریخ لاہور کے مشہور تاریخ گو پیر غلام دستگیر نامی صاحب "تاریخ جلیلہ" کا کہا ہوا ہے، پیر صاحب درگاہ حضرت عبد الجلیل چوہڑ بندگی (م ۹۱۰ھ / ۱۵۰۵ء) کے سجادہ نشین اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے،

حضرت میاں میرؒ کی درگاہ سے جانب مشرق چند قدم کے فاصلہ پر ایک وسیع و عریض تالاب کے وسط میں شاہزادہ داراشکوہ کی اہلیہ نادرہ بیگم بنت شہزادہ پرویز بن جہانگیر کا عالیشان مقبرہ ہنوز بڑی اچھی حالت میں موجود ہے، سہسرام میں شیر شاہ سوری کا مقبرہ، شیخوپورہ میں ہرن مینار سے متصل بارہ دری اور امرتسر میں ہر مندر نادرہ بیگم کے مقبرہ کی طرح تالابوں کے وسط میں تعمیر کئے گئے ہیں،

نادرہ بیگم کا انتقال سفر کے دوران میں بلوچستان میں ہوا تھا، داراشکوہ نے گل محمد بلوچ کی نگرانی میں اس کی میت تدفین کے لئے لاہور روانہ کی، اس سانحہ کے چند روز بعد داراشکوہ کو ملک جیون نے گرفتار کرکے دہلی بھیج دیا،

نادرہ بیگم کے مزار پر لوح نصب نہیں ہے، قبر کے تعویذ کے سرہانے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور کلمۂ طیبہ منقوش ہے، اور پائنتی کی طرف یہ عبارت مرقوم ہے،

نادرہ بیگم
زوجہ
شہزادہ داراشکوہ
سنہ وفات سنہ ۱۰۶۹ھ سنہ ۱۶۵۹ء

نادرہ بیگم کے تالاب سے جانب جنوب ایک وسیع قبرستان ہے، اور اس کے وسط میں ایک بلند چبوترے پر حضرت میاں میرؒ کے خادم خاص اور محرم راز میاں نتھا کا مزار ہے، داراشکوہ نے سکینۃ الاولیاء میں خاص طور پر ان کا ذکر کیا ہے، اور حضرت میاں میرؒ کے بارے میں کئی روایات ان کی زبانی نقل کی ہیں،

حضرت میاں میر کی رہائش انارکلی بازار میں پنجاب یونیورسٹی پریس کے قریب تھی، حضرت میاں نتھا، میاں میرؒ صاحب کی زندگی ہی میں فوت ہوگئے، تو انھیں خانی پورہ[1] میں دفن کیا گیا، حضرت میاں میرؒ نے اپنی وفات سے قبل میاں نتھا کی قبر سے قریب دفن ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا، میاں میر کو بھی میاں نتھا کے ساتھ بڑی محبت تھی، میاں نتھا فنا فی الشیخ ہو چکے تھے، اور میاں میرؒان کی وفات کے بعد انھیں نتھا کی بجائے

[1] اب یہ جگہ "میانیؔ" کہلاتی ہے،

"نتھا" کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ میاں نتھا کی لوحِ مزار پر یہ عبارت درج ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مرکزِ تجلیات

حضرت میاں نتھا رحمۃ اللہ علیہ

حضرت میانمیر رحمۃ اللہ علیہ کے قابلِ فخر مرید

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو

ید بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

تاریخِ وفات ۱۰۲۶ھ / ۱۶۱۷ء بروز پنجشنبہ[1]

۱۷ اپریل ۱۹۷۳ء کو پتھر نصب ہوا

میانمیر ریلوے اسٹیشن کی طرف آتے ہوئے گڑھی شاہو کے چوک میں جامعہ نعیمیہ کے عقب میں ایک بڑا قبرستان ہے، جو قبرستان بی بیاں پاکدامناں" کے نام سے موسوم ہے" یہ بی بیاں حضرت سید احمد توختہ ترمذی (م ۶۰۲ھ) کی صاحبزادیاں تھیں، اور ان کے نام بی بی تاج، بی بی حاج، اور بی بی گوہر بتائے جاتے ہیں، آج بھی اکبری دروازہ کے اندر ایک محلہ چلہ بی بیاں کے نام سے موجود ہے جس میں ان کی چلہ گاہ اور اس سے قریب پیر غلام دستگیر نامی مرحوم کے مکان کے عقبی صحن میں حضرت توختہ ترمذیؒ کا مزار محفوظ ہے، برطانوی عہد میں شیعہ حضرات نے بی بیاں پاکدامناں کے مزار پر قبضہ کرکے یہ مشہور کردیا کہ یہ بی بیاں

---

[1] ۱۰۲۶ھ مطابق ۱۶۱۷ء ہونا چاہئے، لیکن سنگ تراش نے غلطی سے ۱۶۰۷ء کندہ کردیا ہے، جو صحیح نہیں ہے، میں نے صحیح سنہ لکھ دیا ہے،

میدانِ کربلا سے راتوں رات یہاں چلی آئیں اور جب پہنچیں تو انھوں نے بارگاہِ خداوندی میں التجا کی کہ نامحرموں کی نظریں ان پر پڑیں گی، اس لئے انھیں زندہ درگور کردے، چنانچہ زمین پھٹی اور وہ اس کے اندر سما گئیں، اب ان کے مزارات سے متصل ایک امام بارگاہ تعمیر ہوگیا ہے۔

کسی زمانہ میں یہ قبرستان بہت وسیع تھا اب لوگوں نے قبریں صاف کرکے مکانات بنالئے ہیں، اور قبرستان کئی حصوں میں تقسیم ہوگیا ہے، ایک مکان کے باہر "احاطہ قبرستان شیخ غلام محمد شیخ غلام علی قوم ککے زئی" کی تختی نصب ہے، اس مکان کے عقبی صحن میں لاہور کے معروف پبلشر شیخ محمد اشرف کی قبر ہے۔ اُن کی کچی قبر کے سرہانے لوہے کی ایک پلیٹ پر یہ عبارت مرقوم ہے،

۷۸۶

شیخ محمد اشرف مرحوم ولد غلام محمد

تاریخ پیدائش ۱۹۰۳ء، تاریخ وفات بروز جمعہ ۹ رمئی ۱۹۸۰ء

۹ بجے شب

شیخ محمد اشرف مسلکاً اہلحدیث تھے، ان کے دو فرزند ان کی زندگی ہی میں فوت ہوگئے تھے، ان کی بیٹی، اور ایک پوتی سے اولاد کا سلسلہ چلا ہے،

قبرستان بی بیاں پاکدامناں میں ایک ٹیلہ چاروں طرف سے مکانوں میں گھر کر رہ گیا ہے، اس ٹیلے کے شمال مشرقی گوشے میں علامہ اقبال کی اہلیہ اور جاوید اقبال کی والدہ کی قبر ہے، شروع میں اس قبر کے گرد سیمنٹ کی جالیاں لگوائی تھیں، جو اب ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں،

اس قبر کے سرہانے لوح نصب نہیں ہے، تعویذ پر یہ عبارت مرقوم ہے:

٧٨٦

هو الباقی

سردار بیگم

اہلیہ

علامہ محمد اقبال

تاریخ وفات

۲۳ مئی سنہ ۱۹۳۵ء

راہی سوئے فردوس ہوئی مادر جاوید
لالے کا خیاباں ہے میرا سینۂ پرداغ
ہے موت سے مومن کی نگہ روشن و بیدار
اقبال نے تاریخ کہی "سرمہ ما زاغ"

سنہ ۱۳۵۴ھ

قبرستان بی بی پاکدامنان میں جنازہ گاہ سے باہر نواب زادہ لیاقت علی خاں کے برادر بزرگ نواب سجاد علی خاں کی قبر ہے، ان کا ذکر اور تصویر تذکرۂ رؤسائے پنجاب میں موجود ہے، ان کی شکل و صورت حیرت انگیز حد تک نواب زادہ لیاقت علی خاں سے ملتی ہے، ان کی لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے :-

یا اللہ یا محمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

آخری آرامگاہ

نواب محمد سجاد علی خاں

رکن الدولہ شمشیر جنگ آف کرنال

برادرِ بزرگ نواب زادہ لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان

تاریخ پیدائش سنہ ۱۸۹۲ء بمقام کرنال

تاریخ وفات ۲۶ مئی سنہ ۱۹۶۹ء بمطابق ۹ ربیع الاول سنہ ۱۳۹۸ھ

انا للہ وانا الیہ راجعون

چوبُرجی سے جو سڑک ملتان روڈ کی طرف جاتی ہے، اسے بہاول شیر روڈ کہتے ہیں، اس سڑک کے بائیں جانب آبادی ہے، اور دائیں جانب قبرستانِ میانی کا ایک خطہ ہے، اس خطے میں سڑک سے اندازاً سو میٹر کے فاصلہ پر ایک چاردیواری کے اندر سابق ریاست حیدرآباد دکن کے وزیر خزانہ نواب فخر یار جنگ محوِ خوابِ ابدی ہیں،

نواب صاحب کا اصل وطن دھوگڑی ضلع جالندھر تھا، لیکن وہ ملازمت کے سلسلہ میں مدتوں حیدرآباد میں رہے، ان کے فرزند نواب مشتاق احمد خاں بھی نظام ریلوے میں بڑے اونچے عہدے پر فائز رہے، اور قیامِ پاکستان کے بعد کچھ عرصہ تک نظام کے سفارتی نمائندے کے طور پر کراچی میں مقیم رہے، انھوں نے اپنے والد کے احوال و آثار "حیاتِ فخر" کے عنوان سے شائع کئے ہیں، اس کتاب سے اس عہد کے حیدرآباد کی معاشرت اور درباری سازشوں پر روشنی پڑتی ہے، نواب فخر یار جنگ کی لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کل من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

فخرالدین احمد خاں فخر یار جنگ

ختم المغفور

۱۳۷۵ھ

اگرچہ بود در دنیا امیرے — ولیکن پیش حق ہر دم فقیرے

ازاں تاریخ فخرالدین فقیرے — بود از فضل در جنت امیرے

۱۳۷۵ھ

روز جمعہ ۱۱ ذی الحجہ سنہ ۱۳۷۵ھ

میکلوڈ روڈ لاہور کی بڑی معروف شاہراہ ہے، جو ابتدائی برطانوی دور کے اس انگریز گورنر کے نام منسوب ہے، جس کے بارے میں مرزا غالب نے کہا تھا:

کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام — فرمانروائے کشور پنجاب کو سلام

حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس — نواب مستطاب امیر شہ احتشام

جم مرتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقت رزم — ترکِ فلک کے ہاتھ سے وہ چھین لیں حسام

اسی میکلوڈ روڈ پر صنوبر سینما کے سامنے شیعہ حضرات کا قبرستان ہے، جو "مومن پورہ" کے نام سے موسوم ہے، اس قبرستان کے صدر دروازہ سے اندر داخل ہوتے ہی بائیں ہاتھ چند قدم کے فاصلہ پر مشہور تاریخ داں سید عبدالقادر کی قبر ہے، موصوف نے اپنے شاگرد رشید پروفیسر شجاع الدین مرحوم کے ساتھ مل کر تاریخ اسلام اور تاریخ ہند و پاکستان لکھی ہیں، ان کے علاوہ تاریخ انگلستان بھی ان کی تصنیف ہے، اپنے موضوع پر اردو زبان میں یہ بہترین کتاب ہے، سید عبدالقادر کی لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آخری آرامگاہ

سید عبدالقادر ایم اے

پروفیسر تاریخ و پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور

وفات

اتوار ۲۲ جنوری ۱۹۵۶ء — ۸ جمادی الثانی ۱۳۷۵ھ

فکر و تحقیق کا وہ حاصل تھے — مخزنِ علم صاحبِ دل تھے

ان سے قائم تھا وقار ملت کا — آبروئے وطن کے حامل تھے

رہگذارِ حیات شاہد ہے — ہر قدم پر وہ شمعِ منزل تھے

بزمِ ہستی سے اٹھ گئے صد حیف

فنِ تاریخ میں وہ کامل تھے

سنہ ۱۹۵۶ء

سید عبدالقادر کی قبر سے پندرہ بیس قدم کے فاصلہ پر جانب مشرق قبرستان کی شمالی دیوار کے قریب سید امتیاز علی تاج محوِ خوابِ ابدی ہیں، ان کے ڈرامے انارکلی کو شہرت دوام ملی ہے، انھوں نے آرام، حباب، رونق، ظریف، مراد کے ڈرامے مرتب کرکے طبع کئے تھے، وہ بڑے اچھے مترجم تھے، ان کے تراجم میں سے محاصرہ، غرناطہ، آدا بو۔آرا اور شاہکار، تصادیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں، تاج صاحب نے "بھارت سپوت" کے عنوان سے گاندھی جی کی سوانح حیات بھی لکھی تھی، قرطبہ کا قاضی اور خورشید بھی ان کی مشہور کتابیں ہیں،

تاج کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے، اس پر یہ عبارت مرقوم ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ

مرقد

سید امتیاز علی تاج

ولادت :- ۱۳ راکتوبر ۱۹۰۰ء

شہادت ۱۹ راپریل ۱۹۷۰ء

باغِ جنت میں شگفتہ ہو ترے دل کی کلی
تجھ کو عقبیٰ میں ملے قربِ حسین ابن علی
۱۳۹۰ھ

تاج صاحب کی قبر سے متصل جانبِ مشرق ان کی والدہ محمدی بیگم کا مزار ہے، مرحومہ تہذیب نسواں کی مدیرہ تھیں، ان کی تصانیف میں سے خانہ داری، انمول موتی اور نعمت خانہ قابلِ ذکر ہیں، محمدی بیگم کی لوحِ مزار پر یہ عبارت منقوش ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کل من علیھا فان

این است خوابگاہ محمدی بیگم اہلیہ سید ممتاز علی کہ خیلے جذبہ ہمدردی در دل داشت و در سود و بہبود دختران ہند محنتے بسیار کشید و برائے افادۂ ایشاں صحیفہ ہفت روزہ تہذیب نسواں اجرا نمود، پس از رنجوری شدید و علالت مدید بعمر سی و سہ سال بمقام شملہ بتاریخ ۲ نومبر ۱۹۰۸ء رحلت کرد و حسبِ وصیت جسدش بہ لاہور آوردہ سپرد خاک نمودند۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مومن پورہ کی جنوبی دیوار کے ساتھ مشہور شاعر اور ماہر تعلیم سید عابد علی عابد کی قبر ہے،

سید صاحب کی تصانیف میں سے ان کا مجموعہ کلام شب نگار بندوں، دکھ سکھ، اور سہاگ (ناول) شمع (ناول) طلسمات (افسانے) ید بیضا، (ڈرامے) یہ ہے شمالی افریقہ (جان گنتھر کی کتاب کا ترجمہ) بریشم عود، انتقاد، تلمیحات، اقبال، تنقیدی مضامین اور شعر قابل خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

سید عابد علی عابد کی ایک غزل پیشِ خدمت ہے،

چپ بھی ہے ناگوار دنیا کو — کون سنتا جو بات ہم کرتے
ضبط غم پر ہیں لوگ ہم سے خفا — کیا گذرتی جو عرض غم کرتے
کس نے سیکھی صنم گری کی ادا — مرگئے ہم صنم صنم کرتے
یہی حسرت رہی کہ بدام کہ ہم — سر کسی آستاں پہ خم کرتے
میرے شکووں پہ اس نے ہنس کے کہا — کس نے کی تھی وفا جو ہم کرتے
کچھ نہیں ان سے رسم و راہ نہیں — مدتیں ہو گئی ہیں غم کرتے

عابد کی ایک اور غزل کے تین شعر حاضر ہیں

آپ کو پاکیٔ داماں کا بڑا دعویٰ ہے — نہ دھلے خونِ شہیداں تو مزا آجائے
نقش بندوں کو ہے یہ ناز کہ چپ ہے تصویر — بول اٹھے صورتِ بے جاں تو مزا آجائے
ساقیا تیری محفل میں خداؤں کا ہجوم — محفل افروز ہو انساں تو مزا آجائے

عابد مرحوم کا یہ شعر زبان زد خلائق ہے،

آشنا سا نظر آیا رہزن — آپ کی راہ بڑی یاد آئی

مجھے خوب یاد ہے کہ ان کی وفات پر اخبارات نے صفحہ اول پر ان کے یہ دو شعر جلی حروف میں شائع کئے تھے،

بات نرمی سے یوں وہ کرتے ہیں — جیسے لہرائے ریشمی آنچل
دم رخصت وہ چپ رہے عابد — آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

عابد کی لوح مزار پہ یہ عبارت منقوش ہے:-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مرقد

سید عابد علی عابد

تاریخ وفات

۲۰ جنوری ۱۹۷۱ء

ہم زباں چپ ہوگئے ہم داستاں چپ ہوگئے
کیسے کیسے غزل آرا ناگہاں چپ ہوگئے

اسی قبرستان کی مغربی دیوار کے قریب، سید عابد علی عابد کی قبر سے اندازاً بیس میٹر جانب شمال مغرب مشہور شاعر ناصر کاظمی کی قبر ہے۔ ناصر کاظمی کا مجموعۂ کلام، نشاطِ خواب، پہلی بارش، برگ نے، اور دیوان کی صورت میں طبع ہو چکا ہے۔ موصوف انبالہ کے رہنے والے تھے، اور اس کا ذکر انھوں نے اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے،

انبالہ ایک شہر تھا سنتے ہیں اب بھی ہے،
میں ہوں اسی لٹے ہوئے قریے کی روشنی

تقسیم ملک کے موقع پر رونما ہونے والے حادثات کا ان کے ذہن پر بڑا اثر تھا۔ آتش زنی کے واقعات سے متاثر ہو کر انھوں نے کہا تھا:

شہر در شہر گھر جلائے گئے، — یوں بھی جشن طرب منائے گئے

ناصر کا یہ شعر تو دل میں رکھ لینے کے لائق ہے:-

یادوں کی سیڑھی سے ناصر — رات اک سایہ سا اترا تھا۔

ناصر کی ایک غزل کے تین شعر پیش خدمت ہیں:

وہ میکدے کو جگانے والا، وہ رات کی نیند اڑانے والا — یہ آج کیا اس کے جی میں آئی کہ شام ہوتے ہی گھر گیا وہ
وہ رات کا بے نوا مسافر، وہ تیرا شاعر، وہ تیرا ناصر — تری گلی تک تو ہم نے دیکھا تھا پھر نہ جانے کدھر گیا وہ
وہ ہجر کی رات کا ستارہ، وہ ہم نفس ہم سخن ہمارا — سدا رہے اس کا نام پیارا، سنا ہے کل رات مر گیا وہ

ناصر کی لوح مزار پہ یہ عبارت مرقوم ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علی — محمد — فاطمہ

حسن — دائم آباد رہے گی دنیا، — حسین

ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

ناصر کاظمی

ولد

سید محمد سلطان کاظمی مرحوم

تاریخ پیدائش : ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء انبالہ

تاریخ وفات : ۲ مارچ ۱۹۷۲ء لاہور

میں جس وقت ناصر کی قبر کا کتبہ نقل کر رہا تھا، تو کئی بار میری زبان پر ان کا یہ شعر آیا:

گہری نیند سے جاگو ناصر
وہ دیکھو سورج نکلا ہے

مطبوعات جدیدہ

مسلمانوں کی جدوجہد آزادی :- مرتبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب
متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۹۲، قیمت ۲۰ روپے، پتہ
مکتبہ تعمیر انسانیت اردو بازار، لاہور۔

یہ کتاب دراصل تحریک پاکستان کی سرگذشت ہے، جس کی جڑیں گذشتہ کئی صدیوں
تک پھیلی ہوئی ہیں، اس لئے مصنف نے اس کا آغاز اکبری دور کے فتنہ دین الٰہی سے کیا ہے،
جو مسلمانوں کو دوسری قوموں میں خلط ملط کر دیتا، اگر حضرت مجدد الف ثانیؒ ہند میں سرمایۂ
ملت کے نگہبان بن کر نمودار نہ ہوئے ہوتے، پھر مغلوں کا چراغ ٹمٹمانے لگا اور انگریزوں کا
تسلط ہو چلا تو شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی علمی، دینی اور سیاسی تحریک نے مسلمانوں کو بڑا سہارا
دیا، ان کے اور ان کی اولاد کے بعد حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقا کی جدوجہد کا آغاز
ہوا، اس کے علاوہ بنگال میں بھی بعض اسلامی تحریکیں وجود میں آئیں مصنف نے ان سب کا
جائزہ لیکر ان کے سیاسی مقاصد اور اثرات کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے، انھوں نے انگریزوں
کے خلاف جنگ پلاسی، ٹیپو سلطان کی جدوجہد اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا ذکر کیا ہے،
اور ان کے اثرات و نتائج نیز ان میں مسلمانوں کی سرگرمی دکھائی ہے، سرسید کی تحریک کی مختلف
نوعیتوں تعلیمی، ادبی، سیاسی وغیرہ پر بھی اچھی بحث کی ہے، آخر میں بیسویں صدی کی ابتدا سے
پاکستان کے وجود میں آنے تک کی مسلمانوں کی قومی و سیاسی جدوجہد کا مرقع پیش کیا گیا ہے،

اور ملک کے عام سیاسی میلانات و رجحانات کے علاوہ عالم اسلام کی صورت حال اور علمائے ہند کی سیاسی
و دینی تحریکوں رد عیسائیت، ریشمی رومال اور خلافت وغیرہ کا پس منظر بھی بیان کیا ہے، اس کتاب میں
جہاں مسلمانوں کی جدوجہد اور ان کی بیداری میں اقبال کا حصہ اور مسلم لیگ کے کارنامے بیان
کئے گئے ہیں وہاں ان واقعات اور ہندوؤں کی تحریکوں کا بھی ذکر ہوا ہے جو مسلمانوں کے خلاف
نفرت و اشتعال کا باعث ہوئیں اور جن کی وجہ سے کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان خلیج بڑھتی گئی
اور مسلمان کانگریس سے دور اور مسلم لیگ سے قریب ہوتے گئے اس قسم کے بعض عنوانات سے کتاب کی
نوعیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، "اردو ہندی تنازعہ، تقسیم بنگال، جداگانہ انتخابات، مسلم لیگ کا
قیام، میثاق لکھنؤ، نہرو رپورٹ، گول میز کانفرنس، ۱۹۳۵ء کا قانون اور مسلم لیگ کا رد عمل،
مسلم لیگ کی تنظیم نو، ۱۹۳۷ء کے انتخابات، کرپس مشن کی تجاویز، ہندوستان چھوڑ دو، جناح
گاندھی گفت و شنید، شملہ کانفرنس، عام انتخابات، کیبنٹ مشن کی تجاویز، عبوری حکومت،
دستور ساز اسمبلی، لندن کانفرنس سے مسلم لیگ کا بائیکاٹ، مسلم کش فسادات وغیرہ، مصنف نے
قیام پاکستان کے بعد پیدا ہونے والے جن اہم مسائل کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں، بھارت کی مسلم اقلیتیں، مسئلہ کشمیر
سقوط حیدرآباد، جوناگڑھ اور دیگر مسلم ریاستیں، قرارداد مقاصد، تحریک پاکستان بطور تحریک اتحاد اسلامی
قیام پاکستان کا اثر عالم اسلام پر، کتاب کے آخر میں ان مختلف عناصر کا تذکرہ ہے، جنھوں نے پاکستان کی
تحریک میں حصہ لیا تھا، ان میں صحافیوں، شاعروں، ادیبوں، افسانہ نگاروں، طلبہ، خواتین اور نوجوانوں
کے علاوہ مندرجہ ذیل علما کا علیحدہ تذکرہ ہے (۱) مولانا اشرف علی تھانوی (۲) مولانا شبیر احمد عثمانی
(۳) مولانا ظفر احمد عثمانی اور (۴) مولانا مفتی محمد شفیع اور سب کے آخر میں ستائیس قائدین کا مختصر حال دیا ہے اور قیام
پاکستان میں انکی مساعی بھی دکھائی ہیں، کتاب کے نقطۂ نظر سے چاہے کسی کو اتفاق نہ ہو مگر یہ گذشتہ سو برس کے
واقعات کا اچھا ماخذ ہے، اور اس سے بہت سی مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں، مگر چونکہ یہ ریڈیائی تقریروں کا مجموعہ ہے اسلئے
اس میں بڑے اختصار سے کام لیا گیا ہے، اسکی ترتیب میں بھی کچھ خامیاں ہیں، مصنف ابواب پر مرتب کرتے تو اس سے
استفادے میں سہولت ہوتی۔

مخطوطاتِ کتب خانہ ہمدرد (جلد اول) مرتبہ جناب فضل اللہ فاروقی ندوی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۸۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت:- ۳۰ روپے، پتہ:- ہمدرد فاؤنڈیشن پریس، کراچی، نمبر ۱۸

ہندوستان میں حکیم عبد الحمید کی طرح پاکستان میں ان کے برادر خورد حکیم حافظ محمد سعید دہلوی طب یونانی کا چراغ مخالف ہواؤں میں روشن کئے ہوئے ہیں، جس کی لو ان کی مساعی جمیلہ سے روز بروز تیز ہو رہی ہے، حکیم محمد سعید بڑے علم دوست بھی ہیں، اور اچھا علمی ذوق رکھنے کے علاوہ تصنیف و تالیف کا عمدہ سلیقہ رکھتے ہیں، خدمت خلق، نفع رسانی، اور فیض بخشی ان کی عادت ثانیہ بن گئی ہے، ان کی علمی دلچسپی کا ایک مظہران کا شاندار کتبخانہ بھی ہے، جو مختلف الفنون مطبوعات اور بیش قیمت نوادرات اور مخطوطات پر مشتمل ہے، حکیم صاحب کو مختلف ملکوں میں تشریف لیجانے اور وہاں کے کتبخانوں کو دیکھنے کا برابر موقع ملتا رہتا ہے، اس لئے انھیں بھی کتب خانوں کے بارہ میں مفید تجربے اور جدید معلومات ہو گئے ہیں، اور وہ اپنے کتبخانہ کو بھی جدید طرز پر آراستہ کرنا چاہتے ہیں تاکہ مطالعہ و تحقیق کرنے والوں کو پوری سہولت بہم پہنچا سکیں، اسی غرض سے انھوں نے اپنے کتبخانہ کے مشمولات کی مختلف فہرستیں شائع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، جس کے تحت مخطوطات کی توضیحی فہرستوں پر کام شروع کر دیا گیا ہے، زیر نظر کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، جو کتبخانہ کے صرف طبی مخطوطات کی فہرست ہے، یہ بھی حکیم صاحب کی خوش مذاقی ہے کہ اس کام کے لئے انھوں نے مولوی فضل اللہ ندوی کا انتخاب کیا جو گذشتہ کئی برسوں سے مختلف کتبخانوں سے وابستہ رہے ہیں، اور مخطوطات شناسی اور فہرست سازی کے کام میں مہارت اور تجربہ رکھتے ہیں، انھوں نے محنت اور سلیقہ سے مندرجۂ ذیل پانچ عنوانات کے تحت حروف تہجی کی ترتیب سے مخطوطات کے بارہ میں ضروری معلومات تحریر کی ہیں (۱) کلیات طب (۲) علم الادویہ و قرابادین (۳) امراض و معالجات (۴) مجموعات (۵) نامعلوم الاسم یا فرسکول، ہر ہر کتاب کا نام لکھ کر نیچے جدول میں مصنف و کاتب کا نام، مخطوطہ کی زبان، خط کی قسم، ورقوں اور سطروں کی تعداد، تقطیع، لوح اور جدول کی وضاحت کی ہے، اس کے بعد مصنف اور کتاب کے بارہ میں اہم معلومات، کتاب کے مندرجات اور ابتدا، خاتمہ اور ترقیمہ کی عبارت دی ہے، ہر کتاب کا نام انگریزی میں بھی لکھا ہے، اور جن پر مہریں ہیں ان کی صراحت بھی کی ہے، فہرست کے علاوہ کتاب کے اندر بھی بعض بعض اہم مخطوطات کا عکس دیا گیا ہے، شروع میں مرتب کے قلم سے ایک مختصر دیباچہ بھی ہے، اس میں مسلمانوں کی علوم و فنون سے دلچسپی اور ان کے اہم اجتہادی کارناموں، حکیم صاحب کی ادب نوازی، اور کتب خانوں اور کتابوں سے شغف کے علاوہ اہم مخطوطات کا تعارف کرایا ہے، پیش لفظ خود حکیم صاحب کے شگفتہ نگار قلم سے ہے، اس فہرست کی اشاعت ایک مفید علمی خدمت ہے، جو خاص طور پر علم الابدان کا ذوق رکھنے والوں کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہے۔

اعلام و افکار:- مرتبہ جناب سید محمد نقوی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۵۶، مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت بیس روپے، پتہ (۱) دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ وغیرہ۔

یہ گیارہ ادبی، تنقیدی اور سوانحی مضامین کا مجموعہ ہے پہلے مضمون "امیر فتح اللہ شیرازی" میں مولوی محمد حسین آزاد کے یہاں سے چلے ہوئے ایک غلط بیان کی تصحیح کر کے تفسیر منہج الصادقین کو ان کے بجائے ان کے ہم نام ملا فتح اللہ کاشانی کا کارنامۂ کمال قرار دیا ہے، اور ان التباسات کو رفع کیا ہے، جن کی بنا پر دونوں کو ایک ہی شخصیت سمجھا گیا ہے، شیرازی کو ہندوستان بلانے کا سہرا خواجہ دہدار فانی کے سر ہے، ان کی اصل شہرت فارسی شاعر کی حیثیت سے ہٹ کر جمیل جالبی نے

پہلی بار انھیں اردو سخن سرا ثابت کیا ہے، نقوی صاحب کا دوسرا مضمون اس کی مزید شرح و توضیح ہے، ایک مضمون ڈاکٹر شکیل احمد صدیقی مرحوم کے مضمون کی شرح و تفصیل پر مبنی ہے، اس میں ذوالریاستین راجہ درگا پرشاد مہر سندیلوی کے خاندانی حالات، ریاست و امارت اور مملکت علم و فن پر فرمانروائی کا ذکر ہے، اردو اور ہندو فضلا سے متعلق مفید مضامین درج ہیں، ایک میں منشی رام سہائے تمنا لکھنوی کی سرگذشت حیات، تاریخ نگاری اور دوسرے علمی کمالات بیان کیے گئے ہیں، اور دوسرے میں اقلیتوں اور اردو زبان کے سرگرم محافظ پنڈت سندر لال کے حالات اور قومی، سیاسی اور علمی خدمات قلمبند کیے گئے ہیں، ایک اور مفید مضمون میں مفتی میر عباس شوستری سے مرزا غالب کی عقیدت مندی، اور روابط کا ذکر ہے، میر ضمیر اور مرزا دبیر مرثیہ نگاری میں مشہور روزگار تھے، مصنف نے استاد و شاگرد کے مزاج ناموں کا جائزہ لیا ہے، مگر موازنہ و مقابلہ کے بغیر دونوں کے منحرالموضوع اشعار پیش کردیے ہیں، اور ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی کے اس بیان کو غلط اور خلاف واقعہ بتایا ہے کہ مرزا دبیر نے محمدؐ و آل محمدؐ کے علاوہ عام لوگوں کی مدح سے اپنی زبان آلودہ نہیں کی، تاجدار اودھ واجد علی شاہ اختر کی مثنوی حزن اختر کا تیسرا اڈیشن چند برس پہلے شائع ہوا تھا، مصنف نے اس کے مرتب کے بعض اغلاط و مسامحات کی نشاندہی کی ہے، ایک مضمون فراق گورکھپوری کے انٹرویو پر مشتمل ہے جو ہندی سے ترجمہ کیا گیا اور دلچسپ ہے، اس سے اردو اور ہندی کے بارہ میں ان کے نقطۂ نظر کے علاوہ ان کی شاعری اور سیاسی زندگی کے بارہ میں کچھ واقفیت ہوتی ہے، ایک مضمون میں دارالمصنفین کا ذکر خیر ہے، مگر اسکی حیثیت بھی انٹرویو کی ہے، اور اس سے موجودہ ناظم دارالمصنفین جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی یہاں سے وابستگی، تصنیفی زندگی اور دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ ہند کے بارہ میں مفید اور دلچسپ معلومات حاصل ہوتے ہیں یہ سب مضامین خوبی تحریر اور رعنائی بیان کے لحاظ سے بھی دلکش ہیں، تاہم مقامات "آہ و فغاں" سے یکسر خالی نہیں۔